مولانا ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی

مکی اسلام کی تفہیم۔ مسائل و جہات

﴿۲﴾

بابِ طہارت

اسلامی احکام، قوانین اور اعمال کی کتابیں کتاب الطہارۃ سے شروع کی جاتی ہیں۔ اس لئے کہ غالباً فقہی طور سے جسمانی طہارت ارکانِ دین اور اعمالِ مذہب کی ادائیگی کے لئے شرط کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے بغیر ان کی ادائیگی صحیح نہیں ہوتی۔ خالص قانونی نقطۂ نظر سے اُوپر اُٹھ کر اسلامی دین و شریعت کی روح میں اُترنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جسمانی صفائی، بدنی پاکیزگی اور مادی طہارت کا ایک بڑا گہرا تعلق و ربط روحانی طہارت، نفس کے تزکیے اور اندرون کی پاکیزگی سے بھی ہے۔ جسمانی و بدنی طہارت روحانی پاکیزگی تک لے جاتی ہے اور روحانی تزکیہ بدنی صفائی و طہارت کا تقاضا کرتا ہے۔

مفسرینِ کرام، علمائے اسلام اور مفکرینِ عظام نے اس کامل طہارتِ روح و بدن اور ان کے تفاعل کو خوب اُجاگر کیا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ (۱۳۵/ ۱۸۸۷-۱۳۶۹/ ۱۹۵۰) نے لکھا ہے کہ ''جب کپڑوں کا حسی و معنوی نجاستوں سے پاک رکھنا ضروری ہے تو بدن کی پاکی بطریقِ اَولیٰ ضروری ہوگی، اس لئے اس کے بیان کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ بہرحال آیۂ ہٰذا میں طہارتِ ظاہری و باطنی کی تاکید مقصود ہے کیونکہ بدون اس کے رب کی بڑائی کما حقہ دل نشین نہیں ہوسکتی''۔ (۱) مولانا مودودیؒ نے اسی آیت کریمہ کی توضیح میں لکھا ہے کہ ''اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں، ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی''۔ (۲) متعدد دوسرے علما و مفکرین کے ہاں بھی جسم و روح کی طہارت کے بیک وقت التزام کی یہی بحث ملتی ہے۔

طہارتِ بدنی کی اولیت کے سبب ہی بالعموم فقہ و حدیث کی کتابیں ''کتاب الطہارۃ'' سے شروع ہوتی ہیں۔ امام بخاریؒ نے اپنی عظیم کتابِ حدیث کا آغاز اگرچہ دوسرے ابواب سے کیا ہے تاہم

اعمال کی بحث میں ابتدا کتاب الوضوء سے کی ہے جو طہارت کا ایک باب ہے۔ اس میں صرف جسمانی طہارت کا بیان نہیں ہوتا بلکہ جسمانی طہارت اور بدنی پاکی کس طرح روحانی طہارت اور اندرونی پاکیزگی کی طرف لے جاتی ہے اس کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ دونوں کے لازم وملزوم ہونے کے علاوہ ایک کے دوسرے کے لئے وسیلۂ تطہیر ہونے کا بھی حکم ربانی اور حکمتِ نبوی اور فراستِ فقہا کا مشاہدہ وتجربہ کرایا جاتا ہے۔

غسل

جسم کی صفائی اور پاکیزگی کے لئے پورے بدن کو پانی سے دھونا ضروری ہے۔ اسلامی اصطلاح میں اس کو غسل کہا جاتا ہے۔ غسل کی دو قسمیں نظر آتی ہیں، ایک غسلِ طہارت، جس میں بدن کے میل کچیل، گندگی، بو وغیرہ کو دُور کرنے کی صورت پائی جاتی ہے، یہ غسل عام صفائی کے علاوہ گرمی سے بچاؤ اور تدارک کے لئے بھی کیا جاتا ہے۔ صفائی پسند طبائع یوں بھی غسل کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ دوسرا غسلِ جنابت جو بنیادی طور پر کسی حکمی گندگی کو دور کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ وہ خالصتاً دینی حکم اور مذہبی طریقہ ہے۔ احتلام اور بیوی سے مباشرت کے نتیجے میں انسان حکمی گندگی میں مبتلا ہوجاتا ہے، لہٰذا اسے دور کرنے کے لئے غسلِ جنابت کا حکم ہوا۔

پس منظر: دینِ ابراہیمی کا حکم وعمل

گزشتہ بحث میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ وغیرہ کے حوالے سے غسل کا حکم زیرِ بحث آچکا ہے۔ بالعموم اس میں غسلِ جنابت کا حکم ملتا ہے کہ وہ شریعت کے حکم وفیصلے کا محتاج تھا۔ عقل ومنطق حکمی نجاست کو دور کرنے کے لئے اس کا حکم وفیصلہ نہیں کرسکتی، لہٰذا شریعت ودینِ ابراہیمی میں غسلِ جنابت کا قانونی حکم، فقہی باب اور شرعی امر بیان وثابت کیا گیا۔ قریشِ مکہ بالخصوص اور دوسرے عرب قبائل بالعموم غسلِ جنابت کے حکم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ اسی میں غسلِ طہارت کا حکم وعمل بھی شامل تھا۔ عربوں میں غسل کو جسمانی نجاست دور کرنے کا ایک لازمی ذریعہ سمجھا جاتا تھا، صرف یہی نہیں وہ پاکی اور جسمانی طہارت کو ایک عبادت سمجھتے تھے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے:

وان من ابواب العبادة الطهارة، ومازال الغسل من الجنابة سنة معمولة عندهم (۳)

اگرچہ اس میں کپڑوں کی پاکی کا حوالہ نہیں ہے تاہم وہ شامل وموجود ہے کیونکہ جسم وبدن کی

پاکی بے معنی ہو جاتی ہے اگر اس کو ستر و زینت سے آراستہ کرنے والے کپڑے پاک وصاف نہ ہوں۔

دینِ ابراہیمی حنفی میں غسلِ جنابت کے حکم اور عرب قبائل میں اس پر عمل کے عام بیانات کے علاوہ کئی تاریخی روایات اور واقعاتی شہادتیں بھی ملتی ہیں جو اس حکمِ طہارت کے رائج و نافذ اور معروف و مقبول ہونے پر بخوبی دلالت کرتی ہیں۔ ہمارے مشرقی مزاج کا ایک خاصہ یہ ہے کہ کسی بھی اسلامی حکم و تعلیم کے بیان میں لازمی سمجھتے ہیں کہ اس کو خالص اختراع و ایجاد سمجھیں۔ مبالغہ اور غلو بھی اس افراط و تفریط کا ذمے دار ہوتا ہے بعض لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ ہر اسلامی حکم اور نبوی کام کو جب تک بالکل نیا اور بے مثال نہ قرار دے لیں ان کو شریعتِ محمدی کی افضلیت نہیں دکھائی دیتی حالانکہ بسا اوقات ان کے اپنے دوسرے بیانات تردید کرتے ہیں اور تاریخی شواہد تو کرتے ہی ہیں۔ مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ ''رسول اللہ ﷺ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اُٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا'' (۴) حالانکہ حنیفیت کے باب میں یہی بالغ نظر عالم دینِ حنفی کے تصور و عملِ طہارت کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ اور یہ صرف ایک مؤلف و عالم کا حال نہیں، بہت سے حضرات کو جاہلی معاشرے پر دینِ حنفی کے اثرات نظر نہیں آتے۔

سیرتی روایات اور تاریخی بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ بہت سے افراد طہارت کا اہتمام کرتے تھے اور بالخصوص غسلِ جنابت کا تو وہ خاص التزام رکھتے تھے۔ اُن میں سے ایک حضرت صرمہ بن انس نجاری خزرجی رضی اللہ عنہ تھے، جنہوں نے اسلام سے قبل ہی غسلِ جنابت کو لازم کر لیا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی ''مسجد'' میں بھی کسی ''جنبی'' کو آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اسی طرح دوسرے احناف کا معاملہ تھا۔ غسلِ جنابت کا واضح حوالہ ملے یا نہ ملے دراصل وہ حنیف ہونے کی ایک ضروری علامتِ امتیاز تھی، کیونکہ وہ حنیفیت اور دینِ ابراہیمی کا ایک لازمی فریضہ تھا اور اس کی رعایت عام مشرکینِ عرب تک کرتے تھے لہٰذا احناف تو بہ طریقِ اولیٰ اور بہ اہتمامِ خاص اس کا التزام کرتے تھے۔ (۵)

والدِ ماجد جناب عبداللہ بن عبدالمطلب ہاشمی کے جناب آمنہؓ سے نکاح کے ضمن میں ایک روایت ملتی ہے کہ جناب عبداللہ نے مٹی میں کام کاج کیا تھا لہٰذا اُن کا جسم اور کپڑے مٹی سے آلودہ تھے اور جب بی بی آمنہ نے غسلِ طہارت سے قبل ملاقاتِ زن و شو پسند نہیں کی تو اُنہوں نے غسل کیا۔

ان عبداللہ دخل علیٰ امراۃ کانت لہ مع آمنۃ بنتِ وھب، وقد عمل فی طین لہ، وبہ آثار من الطین، فدعا ھالنفسہ، فابطأت

علیہ لمارات من اثر الطین، فخرج من عندھا، فتوضأ و غسل ماکان بہ من ذٰلک الطین فدخل علیھا فاصابھا(۶)

مکی حکمِ طہارت: کپڑے پاک رکھنا

رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرامؓ نے دینِ حنیفی کے حکمِ طہارت کو پوری اسلامی مکی شریعت میں جذب کرلیا۔ اس کے لئے مزید بحث وثبوت کی ضرورت نہیں، اگر ہے بھی تو وہ بحث کے اگلے نکات و جزئیات سے پوری ہوتی جائے گی۔ بہرحال کپڑوں کو پاک وصاف رکھنے کا حکم قرآنِ مجید کی اولین نازل ہونے والی سورتوں میں بھی سب سے پہلے آیا ہے۔ سورۂ مدثر کے نزول کا زمانہ فترۂ وحی کے معاً بعد متعین کیا جاتا ہے اور وہ صحیح روایات کے مطابق اواخرِ شوال یا اوائلِ ذی قعدہ ۱۳ محمدی/ نبوی بمطابق اکتوبر۔ نومبر ۶۱۰ء کا واقعہ ہوگا۔ یعنی وہ اولین حکم الٰہی میں شامل بلکہ سرفہرست ہے۔(۷) تفسیر ابن کثیر کے مطابق فترۂ وحی کے بعد اولین وحی قرآن ہے۔ آیت کریمہ نمبر ۴ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (۸)

اور اپنے کپڑے پاک رکھ۔

حسبِ دستور اس آیتِ کریمہ کے متعدد معانی بیان کئے گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ کلامِ عرب میں ''نقی الثیاب'' کا محاورہ آتا ہے حافظ ابن کثیر نے متعدد معانی ومفاہیم حضرات صحابہ وتابعینؒ سے نقل کئے ہیں لیکن امام ابن تیمیہؒ کے ایک اُصولِ قرآن وتفسیر کے مطابق آیتِ کریمہ کے الفاظ کے ظاہری معانی جن کی طرف ذہن فوراً منتقل ہوتا ہے مراد لینا ضروری ہے، اس بنا پر اس کے واضح اور صرف یہ معنی ہیں کہ گندگی سے اپنے کپڑوں کو پاک وصاف رکھا کرو۔ اور اس کی تائید میں مفسرین وعلما کے متعدد اقوال بھی موجود ہیں۔ مثلاً حضرت محمد بن سیرینؒ (۳۳/۶۵۳۔۱۱۰/۷۲۹) نے اس کے معانی بیان کئے ہیں کہ ان کو پانی سے دھویا کرو۔ حضرت ابن زید کا قول ہے کہ عام مشرکینِ عرب اپنے کپڑوں کو پاک نہیں رکھا کرتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ خود بھی پاک وصاف رہیں اور اپنے کپڑوں کو بھی پاک رکھا کریں۔ حافظ ابن کثیر نے یہ اضافہ بھی کیا ہے کہ اسی قول کو امام طبریؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ ''اپنے کپڑوں کو پاک رکھیے''۔(۹)

امام بخاریؒ نے اس موضوع سے متعلق ایک حدیث بیان کی ہے جو بہت اہم ہے، فرماتے ہیں:

عن جابر بن عبدالله رضی الله عنه قال: سمعت النبی ﷺ و هو یحدث عن فترة الوحی فقال فی حدیثه: فبینما انا امشی اذ سمعت صوتا من السماء، فرفعت راسی فاذا الملک الذی جاء نی بحراء جالس علی کرسی بین السماء والارض، فجئثت منه رعبا، فرجعت فقلت زملونی زملونی، فدثرونی، فانزل الله تعالیٰ "یاایها المدثر. الی. والرجز فاهجر قبل ان تفرض الصلاة، وهی الاوثان (۱۰)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا میں نے نبی ﷺ کو فترۂ وحی کے بارے میں بیان فرماتے ہوئے سنا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: میں اس دوران محوِ خرام تھا کہ اچانک آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنا سر اُوپر اُٹھایا تو وہی فرشتہ نظر آیا جو میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا اور وہ اُس وقت آسمان و زمین کے درمیان ایک کرسی پر تشریف فرما تھا اور میں اُن کے رعب سے بھر گیا۔ لہٰذا میں واپس ہوا اور میں نے کہا کہ مجھے اوڑھا دو، اوڑھا دو، اور لوگوں نے مجھے کمبل اوڑھا دیا۔ تب اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا: یاایھا المدثر سے والرجز فاھجر تک اور یہ نماز کے فرض ہونے سے قبل ہوا تھا۔ (الرجز سے مراد اوثان، بت ہیں)۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے تشریح حدیث میں اور باتوں کے علاوہ لکھا ہے کہ نماز کے فرض ہونے سے پہلے کا مطلب یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ واس سے پہلے بھی کپڑے پاک رکھنے کا حکم تھا: حافظ موصوف نے دوسرے اقوال کے بعد امام شافعیؒ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ آپ پاک کپڑوں میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا (۱۱) حافظ موصوف نے اسی قولِ امام کو زیادہ صحیح اور موزوں قرار دیا ہے۔

متعدد دوسرے مفسرین و محدثین و علما نے اس آیتِ کریمہ میں کپڑوں کے پاک رکھنے یعنی طہارتِ بدنی ہی کو مراد لیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ترجمے میں لکھا ہے "جامہائے خود را پاک ساز" ان کے فرزندِ گرامی حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء۔ ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) نے اسی کا اُردو ترجمہ کر دیا ہے جو اُوپر آیتِ کریمہ کے ترجمے کے بطور نقل کیا گیا۔ یہی ترجمہ مولانا محمود حسن (۱۲۶۸ھ/۱۸۵۱ء۔/۱۹۲۰ء) نے اپنے شہرۂ آفاق ترجمۂ قرآن میں اختیار کیا ہے۔ مولانا مودودیؒ نے

لفظی ترجمہ تو یہی کیا ہے مگر اپنی ترجمانی میں تمام اقوالِ مفسرین کو سمیٹ لیا ہے کہ مادی اور روحانی طہارت سب ہی مرادِ الٰہی میں شامل ہیں۔

غسلِ طہارت

کتبِ سیرت میں بالخصوص غسلِ طہارت کا حوالہ ملتا ہے اور عجیب بات ہے کہ اسلام قبول کرنے کے ضمن میں ملتا ہے یا قرآن کے صحیفے کو چھونے اور تلاوت کرنے کے باب میں۔ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر و مشرک جب اسلام قبول کرنا چاہتا تھا تو وہ نہاتا اور پاک صاف ہوتا تھا۔ غسل کرنے کے لئے یا تو مسلمان مبلغ حکم دیتا تھا یا از خود کافر و مشرک اپنی نجاستِ کفر و شرک کے احساسِ جرم کے سبب غسلِ طہارت کرتا تھا۔ ایسے واقعات کی جغرافیائی حد بندیاں دلچسپ ہیں کہ مختلف علاقوں کے مشرکین و کافرین نے اس سنت پر عمل کیا کیونکہ اسلام قبول کرنے کے لئے غسل کرنا واجب نہیں تھا اور اس کی تصریح علما و مورخین کے اقوال و روایات میں بھی ملتی ہے۔

صحیفۂ قرآن کو چھونے کے لئے غسلِ طہارت

حضرت عمر بن خطاب عدوی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بیان میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب صحابیِ موصوف کا غصہ کچھ کم ہوا تو بہن اور بہنوئی حضرت فاطمہ بنتِ خطاب اور سعید بن زید بن عمرو عدوی رضی اللہ عنہما سے فرمایا کہ اچھا وہ صحیفہ دکھاؤ جو تم پڑھ رہے تھے، حضرت فاطمہؓ نے اُن کی نجاستِ شرک کے حوالے سے کہا کہ پہلے غسلِ طہارت کریں اور حضرت عمرؓ نے تعمیل کی اور پھر صحیفۂ قرآن پڑھا۔ ابن اسحاق کی روایت کے الفاظ ہیں:

وقال لا ختہ: اعطینی ھذہ الصحیفۃ التی سمعتکم تقرؤن انفا، انظر ماھذا الذی جاء بہ محمد فقالت لہ یا اخی! انک نجس، علیٰ شرکک، وانہ لایمسھا الاالطاھر، فقام عمر، فاغتسل، فاعطتہ الصحیفۃ (۱۲)

ابن سعد میں ہے کہ غسل یا وضو کرنے کا اختیار دیا گیا تو حضرت عمرؓ نے وضو کیا: فقام فاغتسل او توضا، فقام عمر فتوضا، اس میں وضو کرنے کا حوالہ بہت دلچسپ ہے، اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ اول یہ کہ وضو کی کوئی نہ کوئی شکل مشرکینِ عرب میں دینِ حنفی سے آئی تھی یا دوسرے اسلامی وضو اُس

وقت تک کفار مکہ میں بھی معروف ہو چکا تھا۔ امام سہیلی نے اپنی بحث میں صحیفۂ قرآن کو چھونے کے لئے طہارت کو فرض و واجب نہیں قرار دیا بلکہ مندوب بتایا ہے اور اس کے دلائل دیئے ہیں۔

اسلام قبول کرنے کے لئے غسلِ طہارت

حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کے لئے غسل کا ذکر نہیں ملتا۔ شاید اس لئے کہ وہ پہلے ہی صحیفۂ قرآن کی تلاوت کرنے کے لئے پاک وصاف ہو چکے تھے اور اُن کی نجاستِ کفر وشرک دور ہو چکی تھی۔ لہٰذا قبولِ اسلام کے لئے انہیں غسل کی حاجت نہ تھی، البتہ حضرت طفیل بن عمرو دوسیؓ کے والدین کے قبولِ اسلام کے وقت غسلِ طہارت کرنے کا واضح ذکر روایات میں آتا ہے۔ حضرت طفیلؓ نے اپنے قبولِ اسلام کے بعد مکہ سے اپنے علاقۂ دوس (جنوبی عرب) کا سفر کیا اور وہاں والدین کو مسلمان کیا اور ان کو اسلام لانے سے پہلے غسل طہارت کا باقاعدہ حکم دیا۔ اس روایت میں کپڑے پاک کرنے کا بھی حوالہ ہے اور اس کی تعمیل کا بھی:

فاذهب فاغتسل و طهر ثيابك، فذهب فاغتسل، و طهر ثيابه فذهبت فاغتسلت (۱۳)

حضرت طفیلؓ کی اہلیہ نے قبول اسلام کا ارادہ کیا تو اُن کو بھی طہارت حاصل کرنے کو کہا

فاذهبي الى حناذى الشرى، قال ابن هشام. ويقال حمى ذى الشرى، فتطهرى منه..... فذهبت فاغتسلت..... (۱۴)

قبول اسلام کے لئے غسلِ طہارت کا ایک بلکہ دو واقعے مدینہ منورہ سے متعلق ہیں کہ جب حضرت اسید بن حضیر اوسیؓ اور حضرت سعد بن معاذ اوسیؓ نے ہجرتِ نبوی سے قبل دعوتِ حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ پر اسلام قبول کیا تو غسلِ طہارت کرنے کے بعد ہی کیا۔ ان دونوں واقعات میں بھی کپڑوں کے پاک کرنے کا واضح ذکر ملتا ہے کہ انہوں نے اپنے دونوں کپڑے بھی پانی سے دھوئے۔

تغتسل، فتطهر، وتطهر ثوبيك..... فقام فاغتسل وطهر ثوبيه

یہ روایت ابن اسحاق ہے (۱۵) یہ غسلِ طہارت دراصل ''تعبدی'' ثواب وعبادت کی بنا پر تھا جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے اور ذیل میں پھر اس کا ذکر ملتا ہے اور دوسری روایات حافظ سہیلی نے اس روایت کو بیان کر کے ایک فصل اپنی بحث میں قائم کی ہے کہ اسلام لانے کے وقت کیا کافر غسل کرے گا: موصوف نے اس کے بعد لکھا ہے کہ ہر کافر کے لئے اسلام لانے کے وقت یہ غسل سنت بن گیا تھا: انہوں نے واضح

کیا ہے کہ یہ غسل لازمی نہیں تھا مگر اسلامی طریقہ بن گیا تھا۔ روایات میں سنت بننے کا واضح ذکر ان الفاظ میں ملتا ہے: کیف تصنعون اذا اردتم ان تدخلو فی ھذا الدین؟ (۱۶) البتہ جنابت سے غسل کرنا ضروری اور واجب تھا۔ اس بحث میں ایک قابلِ ذکر روایت امام ترمذی کی آتی ہے جس میں یہ صراحت ملتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت قیس بن عاصمؓ کو اسلام لانے کے وقت غسل کرنے کا حکم دیا تھا اور اس حکم کو امام ترمذی نے استحباب پر مبنی بتایا ہے۔ (۱۷)

امام ترمذی کی حدیث ورائے اور امام سہیلی کی بحث وتنقید اور دوسرے علما وفقہا کی آرا وفتاویٰ سے ایک اہم ارتقا یہ نظر آتا ہے کہ اس دور میں سنت اور فرض وواجب کا فرق شروع ہو گیا تھا۔ امام ترمذی نے اپنی حدیث کے بعد تبصرہ کیا ہے کہ اہلِ علم کے نزدیک اس حکم پر عمل بطورِ استحباب تھا کہ جب کافر اسلام لائے تو غسل کرے اور اپنے کپڑے بھی دھوئے۔ اسے استحباب کا مسئلہ بتایا گیا ہے۔ (۱۸) اس سے پہلے صفحے پر لفظ سنت کا ذکر آ چکا ہے۔ وہ سنت ہو یا استحباب اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ فرض نہیں تھا۔ اور لازمی اور پسندیدہ کا فرق اور شریعت میں ان دونوں کا امتیاز کرنا ایک اہم شرعی یا احکامی ارتقا تھا جس کا خیال کرنا ضروری ہے کیونکہ بہت سے دوسرے احکام میں بھی یہی سنت وفرض کا فرق وامتیاز نظر آئے گا۔ مگر فرض اور سنت کا فرق وامتیاز بعد کے فقہا وعلما کے فکر واستنباط اور فقہی تفکر پر مبنی ہے۔ صحابۂ کرامؓ اور ان سے زیادہ رسولِ اکرم ﷺ کا تصور (Perception) کیا تھا؟

احادیثِ نبوی اور سیرتی واقعات کے دروبست سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے ذہنِ عالی میں فرض وسنت کا فرق اولین لمحے سے موجود اور واضح تھا اور صحابۂ کرام علیہم الرضوان کو بھی تعلیم وتفکیرِ نبوی سے ان کا امتیاز معلوم تھا۔ اس کی سب سے بڑی دلیل وشہادت غسلِ طہارت اور غسلِ جنابت کی تفریق میں ملتی ہے۔ غسلِ طہارت کو رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ کی اسلامی فراست اور دینی فقاہت نے مستحب ومسنون بتا تھا اور مشرکینِ عرب کو ان کے طبعی اور ذہنی ادراک نے غسلِ جنابت کے وجوب وفرضیت کا حکم اور اس کا ادراک وشعور دینِ حنفی سے اُن کے اندر آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ عام مشرکین عرب اس کو فرض وواجب سمجھتے تھے تو رسولِ اکرم ﷺ اور مکہ مکرمہ کے صحابہ کرامؓ کیونکر نہ سمجھتے؟ اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں غسل یا وضو کے ذریعے طہارت حاصل کرنے کا شعور وادراک بہت اہم ہے۔ وہ شرک کی نجاست کو دور کرنے اور ایمان کی دولت حاصل کرنے کے لئے مسنون ومستحب سمجھا جاتا تھا فرض اسے شاید ہی کسی نے سمجھا ہو۔ البتہ حکمی نجاست سے طہارت حاصل کرنے کا یہ تصور وعمل بہت اہم نفسیاتی،

طبی اور تہذیبی حکم اور اس کے ادراک وشعور کو اُجاگر کرنے میں اہمیت رکھتا ہے۔

غسلِ جنابت

غسلِ طہارت کی روایات میں غسلِ جنابت کا حوالہ وذکر اہل سیر وحدیث کی روایات میں ضرور آتا ہے مگر باقاعدہ غسلِ جنابت کی روایات وآثار نہیں ملتے۔ غالباً اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ وہ دین ابراہیمی حنفی کا ایک مسلمہ اُصول تھا اور قریشِ مکہ اور عرب قبائل کا اس پر عمل تھا۔ لہٰذا اس کے لئے کسی نئے حکم کی ضرورت ہی نہ تھی اور رسولِ اکرم ﷺ نے غسلِ جنابت کو دین قریش کے صحیح اُصول وعمل کی بنا پر مکی اسلام میں قبول فرما کر اسے رائج ونافذ فرمادیا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ اور بعض دوسرے اہل علم کے حوالے سے گزر چکا ہے کہ غسلِ جنابت ان میں معمول کی سنت وفرض تھا۔ سنت بمعنی طریقہ اور فرض بمعنی واجب (۱۹)

اس کی اسلامی تائید خصالِ فطرت بیان کرنے والی حدیثِ نبویؐ اور اُن کی تشریحاتِ محدثین سے بھی ہوتی ہے۔ اس پر بحث ایک خاص فصل میں آگے آتی ہے، کیونکہ وہ نہ صرف خصالِ فطرت سے بحث کرتی ہے بلکہ وہ تمام انبیائے کرام کے دین واحد ''اسلام'' میں مشترک ومعمول سنتوں کے بطور ملتی ہیں۔ اس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ وہ اولین انبیائے کرام سے نسل در نسل یا امت بہ اُمت منتقل ہوتی ہوئی خاتم النبیین ﷺ کے کامل وآخری دین میں بطورِ وراثتِ انبیاء منتقل ہوئی تھیں۔

لیکن اس سے زیادہ سورۃ المائدہ کی آیت ۶ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ ؕ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ کی آیت وضو، غسل وغیرہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ وضو کی بحث زیادہ ملتی ہے اور غسلِ جنابت کی کم، تاہم یہ اپنی جگہ پر ایک اہم حقیقت ہے کہ وضو کا حکم مکی ہے اور مکی عہد میں مسلمانوں کو نماز سے قبل دیا جاچکا تھا، اگرچہ تلاوت اور نزول کے لحاظ سے آیت کریمہ مدنی ہے۔ علما نے ایک اُصول یہ بھی بتایا ہے کہ قرآنِ مجید کی آیات نزول کے لحاظ سے متاخر ہوسکتی ہیں اور حکم کا نفاذ اس سے مقدم ہوسکتا ہے اور بسا اوقات ہوا ہے۔ اس پر زیادہ بحث وضو کے مسئلے پر آتی ہے۔ اسی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب وضو کا حکم مکی ہے تو غسلِ جنابت جو اس میں شامل ہے، وہ بھی اپنے حکم واطلاق کے لحاظ سے مکی ہے۔ اس میں تیمم کو شامل نہیں کیا جاسکتا حالانکہ وہ اسی آیت کریمہ میں موجود ہے کیونکہ روایات واحادیث ثابت کرتی ہیں کہ تیمم کا نزول اور حکم دونوں مدنی ہیں۔

امام سیوطی نے آیتِ وضو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ آیت بالاجماع مدنی ہے حالانکہ وضو مکہ ہی میں نماز کے ساتھ ساتھ فرض کیا گیا تھا''۔ ابن عبدالبر کا قول ہے کہ ''تمام اہل مغازی اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ جس وقت سے رسول اللہ ﷺ پر نماز فرض ہوئی تھی اُس وقت سے آپؐ نے کبھی بغیر وضو کے نماز نہیں پڑھی۔ لیکن اس کے باوجود کہ وضو پر پہلے ہی عمل درآمد ہو رہا تھا بعد میں آیتِ وضو نازل کرنے کی حکمت یہ تھی کہ اس کا فرض ہونا تنزیلِ قرآن کی تلاوت کے ساتھ ہو جائے''۔ (۲۰)

اگرچہ اس میں غسلِ جنابت کا حوالہ نہیں آیا لیکن اس کے مکی حکم کی حقیقت اور بھی ظاہر ہے کہ بغیر طہارت کے نماز نہیں ہو سکتی تھی بلکہ بلا طہارتِ بدنی تو انسان گناہ گار ہوتا ہے اور طہارتِ بدنی نہ صرف گناہ سے بچاتی ہے بلکہ عبادت کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس قیاس و استنباط کی تصدیق حافظ ابن حجر عسقلانی کے ایک بیان سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بقول ابن عبدالبر اہل سیر کا اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر غسل جنابت مکہ میں اُسی طرح فرض ہوا تھا جس طرح نماز فرض کی گئی تھی:

فنقل ابن عبدالبر اتفاق اهل السير علىٰ ان غسل الجنابة انما فرض على النبي ﷺ وهو بمكة كما فرضت الصلاة (۲۱)

یہاں اس نکتے کی طرف پھر توجہ دلانی ضروری ہے کہ غسلِ جنابت دینِ ابراہیمی میں ایک واجب حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ جب اس میراثِ ابراہیمی کے وارث اور دین و ملتِ ابراہیمی کے پیغمبرِ مجدد ہوئے تو وہ فرض دوسرے فرائض ابراہیمی کی مانند از خود آپ ﷺ اور آپ کے صحابۂ کرامؓ پر بطورِ فرض و واجب عائد ہو گیا۔ اس لئے کسی تنزیلی حکم کی ضرورت نہیں تھی۔ نئی تنزیل اور نئے احکام کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں بالکل نیا حکم دیا جا رہا ہو یا کسی پرانے حکم و فرض کی نئی صورت گری کی جا رہی ہو یا اس میں ترمیم و اضافہ فرمایا جا رہا ہو۔

وضو کی فرضیت

بطورِ پس منظر وضو دینِ ابراہیمی سے عربوں میں آیا تھا اور حکمائے عرب باقاعدہ وضو کیا کرتے تھے اور بعض دوسرے لوگ بھی۔ سورۂ مائدہ کے حوالے سے غسلِ جنابت کے ضمن میں یہ بحث گزر چکی ہے کہ مکہ مکرمہ میں نماز کی فرضیت کے ساتھ ہی وضو کا حکم آیا تھا۔ بلکہ سیرتی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ وضو کا حکم اور تعلیم نماز کی فرضیت پر مقدم رہی تھی۔ کیونکہ وضو نماز کی صحت کے لئے ایک شرط ہے اور بلا وضو نماز نہیں

ہوتی، اور رسولِ اکرم ﷺ نے کبھی بلا وضو نماز نہیں ادا کی۔ نماز کی فرضیت کے زمانے میں اختلافِ روایات پایا جاتا ہے۔ مگر روایاتِ سیرت اور احادیث و آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ مجید کی اولین آیاتِ کریمہ سورۂ اقراء کے نزول کے معاً بعد نماز کی تعلیم اور وضو کی ترکیب رسولِ اکرم ﷺ نے عملی طور پر سکھائی تھی۔

ابن اسحاق و ابن ہشام کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ ابھی پہاڑ (حرا) سے اُتر ہی رہے تھے کہ فرشتہ (حضرت جبرائیل علیہ السلام) آپ ﷺ کے سامنے ہویدا ہوئے اور اُنہوں نے اپنے پیر مار کر ایک چشمہ نکالا اور خود وضو کر کے آپ ﷺ کو دکھایا اور پھر آپ نے ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق وضو فرمایا کہ وہ نماز کے لئے ایک ضروری طہارت ہے۔ روایت میں مزید کہا گیا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے گھر آتے ہی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو وضو کی ترکیب سکھائی اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو:

اتاه جبريل، وهو باعلىٰ مكة، فهمزله بعقبه في ناحية الوادى، فانفجرت منه عين، فتوضأ جبريل عليه السلام و رسول الله ﷺ ينظر اليه، ليريه كيف الطهور للصلاة، ثم توضأ رسول الله كما رائى جبريل يتوضأ..... / فجاء رسول الله ﷺ خديجة فتوضأ لها ليريه كيف الطهور للصلاة، كما اراه جبريل، فتوضأت كما توضأ لها رسول الله ﷺ (۲۲)

حافظ ابن حجر نے حافظ ابن عبدالبر کی مذکورہ بالا روایت کے آخر میں کہا ہے کہ آپ ﷺ نے بلا وضو کبھی نماز نہیں پڑھی: پھر امام حاکم کی مستدرک سے نقل کیا ہے کہ اس خیال کو کہ آیت مائدہ سے قبل وضو فرض نہیں تھا رد کرنے کے لئے اہلِ سنت کے پاس دلیل ہونی چاہئے۔ وہ دلیل حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث میں ملتی ہے، روایت ہے کہ ''حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئیں۔ اُنہوں نے عرض کیا کہ یہ قریشی اکابر آپ ﷺ کو قتل کرنے کے لئے معاہدہ کر چکے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میرے وضو کا پانی لاؤ اور پھر آپ نے وضو کیا''۔ حافظِ موصوف نے ہجرت سے قبل وضو کے وجود اور مکہ میں وضو کی فرضیت کے فرق و اختلاف سے بحث کر کے بعض روایات کا حوالہ دوسری کتبِ حدیث و سیرت سے بھی دیا ہے جن میں حضرت عروہؒ کی مغازیٔ رسول ﷺ میں موجود و منقول ابن لہیعہ کی روایت ہے کہ حضرت جبریلؑ نے رسولِ اکرم ﷺ کے پاس وحیِ قرآن لانے کے

وقت وضو سکھایا تھا لیکن اس روایت کو مرسل بتایا ہے۔ بہر حال انہوں نے امام احمد کی ایک موصول روایت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسی روایت کو امام ابن ماجہ اور امام طبرانی نے ''اوسط'' میں موصول روایت کیا ہے۔ البتہ روایتِ ابن لہیعہ زیادہ معروف ہے۔ (۲۳)

حضرت عروہ بن زبیرؒ کی ''مغازیٔ رسول ﷺ'' میں مذکورہ بالا روایت کا ترجمہ اس طرح دیا گیا ہے کہ ''حضرت جبریلِ امینؑ نے پانی کا ایک چشمہ کھولا اور اس سے وضو فرمایا جبکہ محمد کریم علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے اپنا چہرہ، کہنیوں سمیت ہاتھ، ٹخنوں سمیت پاؤں دھوئے اور سر کا مسح کیا، پھر انہوں نے اپنے مخصوص مقام پر پانی چھڑکا۔'' (۲۴)

ابن سید الناس نے اس موضوع پر ابن اسحاق کی ایک مقطوع روایت نقل کرنے کے بعد بتایا ہے کہ حارث بن ابی اُسامہ نے آیتِ وضو و نمازِ اولین کی مذکورہ حدیث کو موصول نقل کیا ہے اور حضرت ابن لہیعہ کی روایت اصلاً حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی روایت ہے، جو موصول ہے۔ اسی کے مانند حضرت امام زہری کی ایک روایت امام سہیلیؒ سے نقل کی ہے اور دوسری احادیث کا بھی حوالہ دیا ہے۔ (۲۵) سہیلیؒ نے باقاعدہ صراحت کی ہے کہ **فالوضوء علی ھذاالحدیث مکی بالفرض، مدنی بالتلاوۃ، لان آیۃ الوضوء مدنیۃ** (۲۶) مولانا کاندھلویؒ نے بھی لکھا ہے کہ ''علامہ سہیلیؒ اس حدیث کو ذکر کر کے فرماتے ہیں کہ پس وضو باعتبار فرضیت کے مکی ہے اور باعتبارِ تلاوت کے مدنی ہے اس لئے کہ آیت وضو کا نزول ہجرت کے بعد مدینے میں ہوا''۔ (۲۷)

خصالِ فطرت

امام بخاریؒ نے پانچ خصالِ فطرت کا ذکر اپنی بعض احادیث و روایات میں کیا ہے، جیسے:

الفطرۃ خمس، او خمس من الفطرۃ، الختان والاستحداد و نتف الابط وتقلیم الاظفار، وقص الشارب۔ (۲۸)

حافظ ابن حجر نے خصالِ فطرت پر ایک طویل بحث میں تمام متعلقہ روایات جمع کر دی ہیں۔ اور ان میں دس بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کا بیان ملتا ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا میں صرف دس خصالِ فطرت کا ذکر ہے اور حدیثِ حضرت ابی ہریرہؓ میں ان پر پانچ زائد ہیں:

المفاء اللحیۃ، والسواک، والمضمضۃ و الاستنشاق، و غسل

البراجم، والاستنجاء۔(۲۹)

انہوں نے امام ابن العربی کا قول نقل کیا ہے کہ تمام روایات کو جمع کرنے سے خصالِ فطرت کی تعداد تیس تک جا پہنچتی ہے۔ امام ابن حجر کا تبصرہ ہے کہ وہ صرف تیس تک محدود نہیں بلکہ اُن کی تعداد اس سے کہیں زیادہ بنتی ہے۔

بہرحال خصالِ فطرت کی تعداد کچھ بھی ہو، ان سب کا تعلق بابِ طہارت سے ہی ہے اور زمانی ومکانی لحاظ سے مکہ مکرمہ سے۔ کیونکہ حدیث کی تصریحات کے مطابق وہ تمام انبیائے کرام کی تعلیمات میں شامل تھیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے عربوں میں آئی تھیں اور ان کے دین ومعاشرت کا حصہ بنی تھیں۔ جاہلی عرب میں ان پر عربوں کا عمل قائم ودائم تھا۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسی بنا پر خصالِ فطرت کو عربوں کی زیرِعمل سنت قرار دیا ہے کذلک الختان و سائر خصال الفطرۃ. (۳۰)

قریش مکہ کی عاداتِ حمیدہ اور خصالِ ستودہ کو رسولِ اکرم ﷺ نے بعثت سے قبل کی زندگی میں جذب کرلیا تھا اور اسلام کی تبلیغ اور دین کی تعلیم کے زمانے میں ان کو مکی تعلیماتِ اسلام کا جزو اور بابِ طہارت کا حصہ بنادیا تھا۔ کیونکہ وہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ بلکہ اس کے عین مطابق ہیں اور اسلام دراصل دینِ فطرت ہی ہے لہٰذا وہ بھی دینِ اسلام کی اجزا بن گئیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیثِ مسلم کے مطابق اہم ترین دس خصالِ فطرت تھیں اور وہ آج بھی ہر ''دین'' میں پائی جاتی ہیں، وہ یہ ہیں:
۱۔ مونچھیں کتروانا، ۲۔ داڑھی بڑھانا، ۳۔ مسواک کرنا، ۴۔ کلی کرنا، ۵۔ ناک میں پانی ڈالنا، ۶۔ ناخن تراشنا، ۷۔ سر میں مانگ نکالنا، ۸۔ بدن کے جوڑوں کو دھونا، ۹۔ بغل اور زیرِ ناف کے بال مونڈنا، ۱۰۔ پانی سے استنجا کرنا۔(۳۱)

عورتوں کی طہارت کے مخصوص مسائل

عمومی طہارت اور عام نظافت میں مردوں اور عورتوں کے مسائل واحکام میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا، مگر عورتوں کی جسمانی ساخت اور بعض فطری فرائض کی بجاآوری کی خاطر اُن کا جسمانی نظام اور اس کے مطالبات کچھ مختلف ہیں۔ ان کے بلوغ کی علامت حیض (ماہواری) کا آغاز ہے جو ایک ماہانہ دورانیے کے مخصوص ایام سے معروف ومعمول ہے۔ وہ بچوں کی ولادت، رضاعت اور پرورش کے فطری فرائض انجام دیتی ہیں اور ولادت کے بعد نفاس کے چالیس دنوں کی نجاست کے دورانیے سے گزرتی ہیں۔ ان دو

مستقل جسمانی معاملات ومسائل کے علاوہ اور بھی بعض مسائل ہیں جن کا تعلق طہارت کے باب سے ہے۔

احادیث نبوی، تفسیراتِ محدثین کرام اور روایاتِ تفسیر وغیرہ سے واضح ہوتا ہے کہ حیض بناتِ آدم پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے وفریضے کے طور پر روزِ اول سے شروع ہوا تھا: ھٰذا شیء کتبہ اللّٰہ علیٰ بناتِ ادم (۳۲) بخاری کی دوسری احادیثِ نبوی، حافظ ابن حجر کی تشریحات اور متعلقہ آیاتِ قرآنی کی تفسیرات بتاتی ہیں کہ شریعتِ محمدی سے قبل بھی ان مسائل کا سامنا عورتوں کو تھا اور ان کی شریعتوں میں ان کے حل بھی بتائے گئے تھے۔ یہودی شریعت میں اتنی سختی تھی کہ مبتلائے آزار خواتین کو مکان بدری تک کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دینِ ابراہیمی کی عرب روایات میں اتنی سختی نہیں تھی۔ حضرت مریمؑ کے باب میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا حاشیہ ہے۔ ''یعنی غسلِ حیض کرنے کو، یہی پہلا حیض تھا، تیرہ برس کی عمر تھی یا پندرہ برس کی۔ کنارے ہوئیں شرم سے وہ مکان مشرق کو تھا۔ اب نصاریٰ قبلہ کرتے ہیں مشرق کو سوائے جماع کے، وہ تمام سماجی فرائض انجام دیتی تھیں اور معاشرتی اختلاط کا بھی خیال رکھا گیا تھا۔ البتہ بعض روایاتِ یہود ان میں بھی آ گئی تھیں جیسے وہ حائضہ کو پورا ناپاک سمجھتے تھے اور اس کے چھونے کو بھی ناپاک خیال کرتے تھے۔ (۳۳) حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں ہے کہ قریش کے لوگ ہجرت سے قبل عورتوں سے اختلاط کے وقت اُن کو پورا عریاں کر دیتے تھے اور ہر طرح سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

دینی فرائض کی بجا آوری کے لئے پاکی شرط ہے، لہٰذا حائضہ عورت مکی دور میں بھی تمام مذہبی فرائض انجام نہیں دے سکتی تھی۔ نماز، روزہ (عاشورہ)، طواف، زیارت، قرأتِ قرآن اور اسی طرح کے دوسرے دینی معاملات میں بھی مدنی دور کے مانند اس کے احکام تھے۔ بعض معاملات میں البتہ مدنی دور میں اضافہ اور ترمیم بھی ہوئی تھی جیسے حضرت ابن عمر کو بحالتِ حیض کی طلاق دینے پر اس سے رجوع کا حکم دیا گیا تھا۔ عہد جاہلی کا ایک تصور یہ تھا جو غالباً مکی عہد میں بھی جاری رہا کہ دورانِ حیض عورت کو پورا ناپاک سمجھا جاتا تھا جیسا کہ حضرت اُمّ ایمن کی حدیث میں ہاتھ کا چھوا بھی ناپاک سمجھا گیا۔ اس پر بحث آگے آتی ہے۔ حیض کی مدت کے بعد عورت کے لئے غسل کرنا واجب تھا۔ جس طرح جماع کے بعد اس کے لئے غسل مردوں کی مانند فرض وضروری تھا۔ دم (خون) حیض کے کپڑوں میں لگ جانے کی صورت میں پورے کپڑے کو دھویا جاتا تھا، بعد میں صرف متاثرہ حصے کے دھونے کا حکم ہو گیا تھا۔ (۳۴)

حیض کے معاملات ومسائل میں بنیادی طور سے مکی اور مدنی دور کا کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔ طہارت کے نقطۂ نظر سے وہی احکام مکہ مکرمہ میں تھے جو مدینہ منورہ میں جاری ہوئے۔ بعض فروعی معاملات

میں مکی دور میں سختی نظر آتی ہے اور مدنی دور میں آسانی۔ قریشی روایات ومعمولات کا فرق بھی پایا جاتا ہے، اور مدنی روایات واعمال کا بھی۔ دونوں کے یہ علاقائی خیالات ومعمولات تھے، اور ایسا ہونا فطری بھی تھا کہ ہر مقام ومکان وعلاقہ کی بعض سماجی روایات اور معاشرتی رویے مختلف ہوجاتے ہیں۔ اگرچہ بنیادی معاملات میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا کیونکہ دونوں مقاماتِ عرب میں دینِ حنفی اور ابراہیمی روایات کا چلن بھی قائم تھا۔

حیض ونفاس کے معاملات میں عربوں میں دینی روایات واحکام اسی حنفی ابراہیمی ضابطے سے آئے تھے۔ اس کا ایک پکا ثبوت استنباطی سہی، ایک حدیثِ نبوی سے ملتا ہے جو مختلف حنفی احکام اور عرب روایات کو اسلام میں سمونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ حضرت اُم عطیہؓ سے ایک حدیث یہ مروی ہے کہ ''ہم کو مُردے (میت) پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منانے سے روکا جاتا تھا سوائے شوہر کے کہ اس کی وفات پر چار ماہ دس دنوں تک سوگ منایا جاتا تھا۔ اس دوران ہم سرمہ لگاتے نہ خوشبو لگاتے اور نہ رنگ دار کپڑے استعمال کرتے سوائے یمن کی چادروں کے۔ حیض سے پاکی کے وقت ہم کو اجازت دی گئی تھی کہ جب ہم میں سے کوئی عورت اپنے حیض کے بعد غسل کرتی تو وہ خوشبو کا استعمال کرتی تھی اور ہم کو جنازوں کی مسابقت سے بھی روکا جاتا تھا'' متنِ حدیث یہ ہے:

عن ام عطیة عن النبی ﷺ قالت کنا نُنهٰی ان نُحِد علیٰ میّت فوق ثلاث، الاعلی زوج اربعة شهر و عشرا، ولانکتحل ولانطیب ولا نلبس ثوبا مصبوغا الاثوب عصب، وقد رخص لنا عندالطهر اذا اغتسلت احدانا من محیفها فی نبذة من کست اظفار و کنا ننهٰی عن اتباع الجنائز۔ (۳۵)

اس حدیثِ نبوی کی رو سے شوہر کی وفات پر مدتِ سوگ اور عورت کی عدت اور اس کے معمولات دینِ حنفی میں بھی تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ حیض کے مسائل بھی اسی سے اسلام میں آئے ہیں سوائے ان رخصتوں اور ترمیموں کے جو رسولِ اکرم ﷺ نے مدنی دور میں کی تھیں۔ نفاس اور ولادت، نکاح اور اختلاطِ زن وشو وغیرہ کے احکام کا بھی یہی معاملہ ہے۔

تاریخی ثبوت کے طور پر حضرت ابوقیس صرمہ بن انس نجاری خزرجی رضی اللہ عنہ کا حنفی طرزِ عمل پیش کیا جاسکتا ہے۔ سیرتی روایات میں واضح بیان آتا ہے کہ حیض کے دوران عورتوں سے مباشرت نہیں کرتے تھے، تاآنکہ وہ پوری طرح پاکی حاصل کرلیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے:

وتطهر من الحائض من النساء۔ (۳۶)

اور وہ اپنی گھریلو مسجد میں نہ جنبی کو داخل ہونے دیتے تھے نہ حائضہ کو۔

بظاہر یہ ایک انفرادی واقعہ معلوم ہوتا ہے مگر وہ عرب مزاجِ طہارت کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے مسجد کی طہارت کا تصور بھی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس میں ناپاک مرد اور غیر طاہر عورت کا داخلہ ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اس کے دوسرے قرینے بھی ملتے ہیں۔ بیت اللہ میں داخلے اور طواف کرنے کے لئے جنابت اور حیض سے مرد و عورت کے بالترتیب پاک ہونے کا واضح اشارہ کتبِ سیرت و تاریخ کی روایات میں پایا جاتا ہے۔ عہدِ جاہلی میں کوئی عورت یا مرد ناپاکی کی حالت میں مسجد میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ طواف اور دوسری عبادتوں کا ناپاکی کی حالت میں انجام دینا تو ناقابلِ تصور تھا۔ عورتوں کے حیض و نفاس کے بیشتر اسلامی مسائل و افکار اور اعمال دینِ حنفی سے آئے تھے کہ دونوں کی اساس و سرچشمہ ایک ہی ہے۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو بیت اللہ کو طاہر رکھنے کا حکم یہی بتاتا ہے۔ تاریخی لحاظ سے ابوکرب اسعد نے خانۂ کعبہ کے قریب حائضہ عورتوں کا جانا ممنوع قرار دیا تھا۔ (۳۷)

ایک اہم تاریخی واقعہ اور حدیثی ثبوت رسولِ اکرم ﷺ کی انا حضرت اُمّ ایمن رضی اللہ عنہا کا ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے ایک بار مسجد سے حضرت اُمِ ایمن رضی اللہ عنہا سے چٹائی مانگی کہ وہ ہاتھ بڑھا کر آپ کو دے دیں۔ اُنہوں نے حائضہ ہونے کا عذر کیا تو رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ حیض کی نجاست ہاتھ میں نہیں ہوتی۔

قالت اُم ایمن قال رسول اللہ ﷺ ناولینی الخمرة من المسجد،
قلت انی حائض، قال ان حیضتک لیست فی یدک۔ (۳۸)

یہ امام طبرانی وغیرہ کی روایت ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کی سند کو منقطع بتایا ہے۔

روایتی نقص کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اسلام کا یہی حکم حائضہ کے بارے میں ہے، لہٰذا درایتی اعتبار سے یہ روایت بالکل صحیح ہے۔

بظاہر یہ واقعہ مدنی دور کا تصور کیا جاتا ہے لیکن اصلاً وہ مکی عہد کا معلوم ہوتا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی انا حضرت اُمِ ایمن کی عمر ہجرت کے وقت لگ بھگ ساٹھ کے قریب تھی اور اُس وقت تک بالعموم عورتیں حیض سے پاک ہوجاتی ہیں۔ حضرت اُمِ ایمن کی ساری اولادیں مکی دور میں پیدا ہوئیں۔ اُن کے آخری شوہر حضرت زید بن حارثہ کلبیؓ ۸/ ۶۳۰ تک زندہ رہے۔ لیکن اس عہدِ مدنی میں اُن کے

اولاد نہیں ہوئی، دراصل مسجد کے لفظ سے غلط فہمی ہوتی ہے۔ اس سے مراد مکی مسجد معلوم ہوتی ہے جو گھریلو بھی ہوسکتی ہے۔ (۳۹)

بابِ نماز

اللہ تعالیٰ کی سنتِ قائمہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز ہمیشہ سے اسلام کا اہم ترین رکن رہی ہے، وہ اسلام جو تمام انبیائے کرام اور رسولانِ الٰہی حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے سے ہر دور میں لاتے رہے۔ وہ صرف شریعتِ محمدی یا دینِ اسلام کے آخری، آفاقی اور ابدی اظہار کا رُکنِ اعظم نہیں رہی بلکہ تمام شرائع میں موجود رہی۔ قرآنِ مجید اس کی سب سے قوی اور متواتر شہادتیں فراہم کرتا ہے اور بلا ریب اسے ہر نبی مکرم علیہ السلام کے دین کا حصہ قرار دیتا ہے۔ سیرتی اور حدیثی مصادر اور تاریخی روایات و آثار سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے اور منطق و عقلِ سلیم بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔

دینِ انبیاء کا رُکنِ اعظم

سورۂ انبیاء مکی ہے۔ اس میں متعدد انبیائے پیش رو کا ذکر فرمانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے نماز کے تعلق سے واضح فرمایا ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۴۰)

ان کو کیا ہم نے پیشوا، راہ بتاتے ہمارے حکم سے، اور کہہ بھیجا اُن کو کرنا نیکیوں کا، اور کھڑی رکھنی نماز، اور دینی زکوٰۃ، اور وہ تھے ہماری بندگی میں لگے۔

اس حکمِ الٰہی سے قبل حضراتِ انبیا میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت یعقوب اور حضرات موسیٰ و ہارون علیہم السلام کا ذکر آیا ہے اور بعد میں جن متعدد انبیائے کرام کا ذکر ہے وہ بھی اس حکمِ الٰہی کے تابع و مصداق ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام مذکورہ بالا انبیائے کرام کے دین و شریعت میں نماز (صلوٰۃ) سب سے بڑی، عظیم ترین اور اہم ترین عبادت تھی۔ ذیل میں حضرات انبیائے کرام کے اسمائے گرامی کے اظہار و ذکر کے ساتھ دینِ اسلام کے اس رکنِ اعظم کو بیان کیا جاتا ہے۔

خاص حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نماز کا حکم مختلف مکی سورتوں میں بھی دیا گیا ہے اور مدنی

سورتوں میں بھی:

مکی سورتوں کی آیاتِ کریمہ

۱۔رَبَّنَآ اِنِّیٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَیْتِکَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِیُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ......(۴۱)

۲۔رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ......(۴۲)

مدنی سورتوں کی آیاتِ کریمہ

۱۔وَعَھِدْنَآ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ اَنْ طَھِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآئِفِیْنَ وَالْعٰکِفِیْنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوْدِ ○ (۴۳)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے والدِ ماجد کے ساتھ حکمِ نماز دیا گیا تھا، جس کا ذکر اُوپر آ چکا، خود حضرت اسماعیل علیہ السلام نہ صرف نماز ادا فرماتے تھے بلکہ اپنی آل واولاد کو بھی اس کا حکم فرماتے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اس باب میں اُن کی تعریف کی ہے:

وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا○(۴۴)

اور حکم کرتا تھا اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا، اور تھا اپنے رب کے ہاں پسندیدہ۔

حضرت اسحاق علیہ السلام اور اُن کے فرزندِ گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام اور اُن کے پوتے حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی نماز کا حکم دیا گیا تھا جس کی وہ پابندی فرماتے تھے اور اپنے اہل و عیال اور اپنی قوم کو بھی اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو بھی مختلف آیات میں حکمِ نماز دینے اور اُن کی تعمیلِ حکم کرنے کا واضح بیان ملتا ہے:

۱۔اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ○(۴۵)

میں جو ہوں، میں اللہ ہوں، کسی کی بندگی نہیں میرے، سو میری بندگی کر، اور نماز کھڑی رکھ میری یاد کو۔

۲۔وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا ۙ○ (۴۶)

اور تاکید کی مجھ کو نماز کی اور زکوٰۃ کی، جب تک میں رہوں جیتا۔

حضرت لقمان علیہ السلام کو بالعموم انبیائے کرام میں شامل نہیں کیا جاتا، تاہم وہ بھی نماز کے

پابند تھے اور اپنے فرزند کو اس کی تاکید کرتے تھے:

۱۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ O(۴۷)

اے بیٹے! کھڑی رکھ نماز اور سکھلا بھلی بات، اور منع کر برائی سے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کو اُن کی قوم نے طعنہ دیا تھا تو نماز کا، کہ کیا وہ ہمیں آبا واجداد کے معبودوں کی پوجا سے روکتی ہے:

۱۔ قَالُوْا یٰشُعَیْبُ اَصَلٰوتُکَ تَاْمُرُکَ اَنْ نَّتْرُکَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِیْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ط .....O(۴۸)

بولے اے شعیبؑ! تیرے نماز پڑھنے نے، تجھ کو یہ سکھایا کہ ہم چھوڑ دیں جن کو پوجتے رہے، ہمارے باپ دادا، یا چھوڑ دیں کرنا اپنے مالوں میں جو چاہیں.....

قرآنِ مجید کی آیاتِ کریمہ کو اگر غور سے پڑھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ بلاریب تمام انبیائے کرام کی شریعت و دین اسلام میں نماز کا رکن اعظم موجود تھا۔ وہ اپنی ذات کے علاوہ اپنے اہل وعیال اور اپنی قوم سب کو اس کی پابندی کرنے کا حکم دیتے تھے۔ متعدد آیاتِ کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ انبیائے کرام کے مومن افراد اور مخلص طبقاتِ قوم نے اپنے دین کے اس رکن وعمل کی پوری حفاظت کی تھی۔ اُن کے اس کارِ نیک پر اللہ تعالیٰ نے اُن کی بھرپور تعریف بھی کی ہے۔ جس طرح نالائق جانشینوں کی، برے کاموں خاص طور پر ترکِ نماز پر اُن کی سخت مذمت کی ہے اور اُن کو موردِ عذاب بتایا ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِہِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّہَوٰتِ فَسَوْفَ یَلْقَوْنَ غَیًّا O(۴۹)

پھر اُن کی جگہ آئے ناخلف، گنوائی نماز، اور پیچھے پڑے مزوں کے، سو آگے ملے گی گمراہی۔

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ ''قرآن کی رُو سے دُنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو۔ اور اُس نے اپنی اُمت کو اس کی تاکید نہ کی ہو.....'' (۵۰)

دینِ حنیفی بطور پس منظر

اہم مسئلہ یہ ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے دین وشریعت میں نماز کا تصور بھی ہے اور اس

پر عمل بھی۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کے دین و شریعت کے زیر اثر وہ دونوں تصور و عمل اُن کی عرب قوم میں بھی آئے تھے اور رائج بھی ہوئے تھے۔ لیکن جب قومِ عرب اپنے دینِ حنفی سے برگشتہ ہوئی اور خرافاتِ دینی اور رذائلِ سماجی کا شکار بنی تو اُس کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اُنہوں نے اپنی پیشرو اور معاصر مذہبی قوموں کی مانند نماز ضائع کر دی تھی یا اُس کا تصور، دھندلا سہی، اور اس پر عمل ناقص ہی سہی، موجود تھا یا نہیں؟ اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ پہلے تو عمومی بیانات ملتے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے مختصر ذکر آ چکا ہے کہ قریش اور دوسرے عرب قبائل میں نماز موجود تھی: کانت فیھم الصلوٰۃ (۵۱) اور نہ صرف مکہ مکرمہ میں بلکہ دوسرے قبائل اور خطوں میں بھی نماز پر عمل پایا جاتا تھا۔ عربوں کے مشہور خطیب، فردِ کامل اور عظیم شخصیت قُس بن ساعدہ ایاری اور قبیلۂ غفار کے حنیف حضرت ابوذر غفاریؓ کے نماز پڑھنے کا حوالہ آ چکا ہے۔ اسی کے ساتھ بعض یہودی اور مجوسی اقوام میں نماز کے مروّج ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

سیرت و تاریخ کے علاوہ حدیثِ نبویؐ کے بعض بیانات، روایات اور آثار بھی اس موضوع پر ملتے ہیں۔ یہ وہ خاص شواہد ہیں جو قریش اور عرب کے نماز پر عامل ہونے کی گواہی دیتے ہیں اور ان میں دینِ حنفی کے رکنِ اعظم کی موجودگی ثابت کرتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانیؒ نے ایک تاریخی حوالے سے لکھا ہے ''ابن الاثیر کا بیان ہے کہ چاشت کی نماز آپ ﷺ حرم ہی میں ادا کرتے تھے کیونکہ یہ نماز قریش کے مذہب میں بھی جائز تھی'' (۵۲) اصلاً یہ روایت بلاذری نے واقدی وغیرہ سے بیان کی ہے اور اس کے الفاظ بالکل ابن اثیر کے مماثل ہیں کہ ابن اثیر ناقل ہیں۔ بعض دوسرے سیرت نگاروں نے بھی اس نمازِ قریش کا حوالہ دیا ہے۔ ابن اثیر کی روایت کے الفاظ ہیں:

وکان ﷺ یخرج الی الکعبۃ اول النھار و یصلی صلاۃ الضحیٰ، وکانت قریش لاتنکرھا (۵۳)

حضرت ابوذر غفاریؓ کی نماز کے بارے میں اخبارِ سیرت میں تفصیل ملتی ہے کہ وہ اور اُن کے ایک حنیف بھتیجے روزانہ نمازیں پڑھا کرتے تھے اور بسا اوقات رات رات بھر نمازیں پڑھتے تھے اور اُن کا قبلہ بقول اُن کے عنایتِ الٰہی سے متعین ہوا کرتا تھا۔

حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کی نماز کے بارے میں امام مسلم کے حوالے سے جو تبصرہ نقل کیا وہ بہت اہم ہے:

قال وقد صلیت یا ابن اخی قبل ان القی رسول اللہ ﷺ ثلاث سنین، قلت لمن؟ قال للہ قلت این توجہ؟ قال حیث یوجھنی ربی (۵۴)

حضرت ابوذر غفاریؓ نے رسولِ اکرم ﷺ سے ملاقات سے تین سال قبل نماز پڑھنے کے معمول کا ذکر اسلام لانے کے بعد ایک صحابی سے کیا تھا اور اپنی نماز کو اللہ کے لے بتایا تھا البتہ وہ اپنے قبلے کا صحیح تعیین نہیں کر سکے تھے۔ اس حدیث و روایت سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ہیئت میں اُن کی نماز اسلامی نماز سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی، ظاہر ہے کہ وہ دوسرے شروط و فرائض اور سنن میں اسلامی نماز نہ تھی کہ اس میں تلاوت قرآنِ مجید وغیرہ اُس کا حصہ نہ تھی۔ البتہ ہیئت قریب قریب وہی رہی ہوگی ورنہ اس کے اختلاف و فرق کا ذکر بھی پایا جاتا۔ ہیئتِ نماز پر بحث کچھ دیر بعد آتی ہے۔

احنافِ قریش میں عظیم ترین شخصیت حضرت زید بن عمرو بن نفیل عدوی کی نماز کی ہیئت کا فرق البتہ واضح طور سے نظر آتا ہے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے حضرات ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کی ملت کی پیروی کی ہے اور ان کے طریقِ عبادت کو بھی اپنا لیا کہ وہ دونوں اس قبلے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہ بہت اہم روایت ہے جو اُن کی نماز بتاتی ہے:

واتبعت ملة ابراھیم و اسمٰعیل وما کان یعبد ان، وکانا لیصلیان الی ھذہ القبلة (۵۵)

یہ نمازِ ابراہیمی و اسماعیلی اور اُن کے قبلے کی تعیین کرتی ہے اور اس صورت میں اُن کی نماز ہیئت میں حضرت ابوذر غفاریؓ سے مختلف نہ ہوگی۔ خانۂ کعبہ کے دینِ ابراہیمی میں مقام و مرتبے کی بنا پر یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حضرت ابوذر غفاریؓ بھی اسی طرف رخ کیا کرتے تھے، اگرچہ وہ قبلے کے بارے میں اُلجھن کا شکار تھے۔ بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ حضرت زید طریقِ عبادت کے بارے میں کشمکش میں تھے اور اپنے پہلوؤں پر سجدہ کیا کرتے تھے اور جنابِ الٰہی میں استغفار و مناجات کیا کرتے تھے کہ ''تیرا پسندیدہ طریقۂ عبادت نہیں معلوم، اگر وہ معلوم ہوتا تو اُس طریقے سے عبادت کیا کرتا'':

اللھم لو اعلم احب الوجوہ الیک لعبدتک بہ، ولکنی لااعلمہ، ثم یسجد علی الارض براحتہ ..... ثم یخر ساجد اللکعبة۔ (۵۶)

اس روایت سے نماز کی نفی نہیں ہوتی کیونکہ وہ بہترین طریقۂ عبادت سے لاعلمی پر معذرت کرتے تھے۔ بعض دوسرے احناف کی نماز کا بھی ذکر ملتا ہے خواہ مضمر طور سے ہو، جیسے یثرب کے حضرت صِرمہ بن انس نجاری خزرجی کی مسجد اور عبادت کا۔

مکی عہدِ نبوی ﷺ میں نماز

اہل سیر کا اجماع ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ پر وحیٔ الٰہی آنے کے بعد ہی نماز فرض کر دی گئی تھی۔ یہ بیان صرف اہل سیر کا نہیں، حدیث کے عالم و امام حافظ ابن عبدالبر قرطبی کا ہے۔ اور اُن کے بیان و اجماع کی تصدیق روایات سے ہوتی ہے۔ سیرتِ نبویؐ اور تاریخ اسلامی کی شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس میں اسلام کے اس رکنِ اعظم کی عہدِ مکی میں فرضیت کا ذکر نہ آیا ہو۔ اور اس پر مکی مسلمانوں کے عمل متواتر کا اجماع تو روایات سے تواتر کی حد تک جا پہنچتا ہے۔ اور صرف سیرت نگار ہی نہیں، متعدد محدثین کرام بھی مکی عہد میں نماز کی فرضیت کے قائل ہیں اور اوّلین روز سے ہی اس کی فرضیت تسلیم کرتے ہیں۔

قدیم ترین سیرت نگاروں میں حضرت عروہ بن زبیرؓ کو امامت کا درجہ حاصل ہے اور وہ اپنے جانشینوں کے لئے بنیادی سرچشمۂ معلومات تھے۔ اُن کی ایک روایت اُن کے شاگرد ابوالاسود محمد بن عبدالرحمٰن اسدی (م ۱۳۰/ ۷۴۷-۷۴۸) نے نقل کی ہے کہ ''حضرت جبرئیل امینؑ نے پانی کا ایک چشمہ کھولا اور اس سے وضو فرمایا..... اور بیت اللہ کی طرف توجہ کر کے دو رکعت ادا کیں، پس حضورِ اقدس ﷺ نے اسی طرح کیا جس طرح آپ ﷺ نے جبرئیلِ امینؑ کو کرتے دیکھا''۔ (۵۷) ایک طرح سے یہ قدیم ترین روایت ہے۔ اور اس کا عنوان ہے ''بعثت کی ابتدا میں نبی کریم ﷺ کی صلاۃ''۔

امام محمد بن اسحٰق نے یہی روایت ''بعض اہلِ علم'' سے نقل کی ہے۔ اس میں بعض الفاظ و تعبیرات کا فرق ہے مگر مفہوم یکساں ہے:

> حدثنی بعض اهل العلم ان الصلاة حين افترضت علىٰ رسول الله ﷺ، اتاه جبريل وهو باعلىٰ مكة..... فتوضا جبريل عليه السلام و رسول الله ﷺ ينظر اليه، ليريه كيف الطهور للصلاة..... ثم قام به جبريل فصلى به، وصلى رسول الله ﷺ بصلوته (۵۸)

دوسری روایت ابن اسحاق نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی سند سے بیان کی ہے اور مذکورہ بالا بلاسند روایت سے بھی نقل کی ہے:

عن عروة بن الزبير عن عائشة رضى الله عنها قالت: افترضت الصلاة علي رسول الله ﷺ اول ما افترضت عليه ركعتين ركعتين، كل صلاة.....(۵۹)

اس کا عنوان ہے: ''ابتدا فرض الصلاۃ'' جو تمام کتبِ اُصول و احادیث میں موجود ہے۔ اگرچہ اس میں زمانۂ فرضیت کا حوالہ نہیں، تاہم اس روایت کو فترۂ وحی کے معاً بعد اور سورۂ الضحیٰ کے نزول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور حافظ ابن سید الناس کی بیان کردہ حضرت مقاتل بن سلیمان کی روایت سے جو ذرا آگے آتی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی روایت و حدیث کا وقت متعین ہو جاتا ہے۔ اور اس کی توقیت مکی یہ ہے کہ آغازِ مکی اسلام میں یہ نمازیں فرض کی جا چکی تھیں۔

بعد کے سیرت نگاروں اور تاریخ نویسوں نے ابن اسحاق و ابن ہشام کی روایت کو اُن کے حوالے سے یا اپنی اپنی سندوں سے بیان کیا ہے۔ ان سب کا اتفاق ہے کہ وحی قرآنی آنے کے ساتھ ہی نماز و وضو کی تعلیم دی گئی تھی۔ امام طبریؒ کی روایت کا حوالہ بعثت اور وحی کے ساتھ ہی وضو کی تعلیم جبریلی کے بارے میں اپنے مقام پر آ چکا ہے اور اس میں صرف وضو کا بیان تھا۔ مگر اصلاً وہ نماز کا بیان رکھتی ہے اور اس کا حوالہ وہاں نہیں دیا گیا تھا صرف یہاں دینے کی خاطر۔ اس میں یہ صاف وضاحت ہے کہ دوشنبہ کو آپ ﷺ کو رسالت ملی اور اسی کے ساتھ وضو اور نماز کی تعلیم بھی دی گئی۔ (۶۰)

وضو اور نماز کی تعلیم جبریل کی روایت دوسرے قدیم سیرت نگاروں کے ہاں بھی ملتی ہے، بس الفاظ و تعبیرات کا فرق ہے (۶۱) جدید سیرت نگاروں میں مولانا شبلیؒ اور اُن کے جامع مولانا سید سلیمانؒ نے ان روایات کا ذکر نہیں کیا ہے، تاہم یہ لکھا ہے کہ ''آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ ﷺ کو ملا، وہ نماز کا تھا اور سورۂ مدثر سے اسے مدلل و مستند بنایا ہے۔ (۶۲)

مولانا ادریس کاندھلویؒ نے ابن اسحاق والی روایت کے لئے دلائل ابی نعیم، ج ۱، ص ۷۰، کا حوالہ دیا ہے اور حافظ ابن سید الناس کی روایت اُسامہ بن زیدؓ کے لئے مسند احمد، سنن دار قطنی اور مستدرک حاکم، سنن ابن ماجہ اور علامہ عزیزی کی شرح جامع صغیر سے سند و ثبوت اور پشتہ فراہم کیا ہے۔ اور علامہ سہیلی کی کتاب الروض الانف کی بحث کا بھی مختصر ذکر کیا ہے جیسا کہ اُوپر آ چکا ہے۔ (۶۳)

مولانا مودودیؒ نے بڑی قطعیت کے ساتھ لکھا ہے اور ان روایات سیرت و تاریخ کی تائید یوں کی ہے۔

''پس یہ پہلا فرض تھا جو نزول اقرأ کے بعد مقرر کیا گیا۔ اغلب یہ ہے کہ یہ اُسی رات کی صبح کا واقعہ ہے جس رات اقرأ نازل ہوئی، مولانا موصوف نے اپنے بیان کی بنیاد تو ابن اسحاق کی روایت پر رکھی ہے مگر اس میں ابن کثیر کی روایت کے الفاظ بھی شامل کر دیئے ہیں جو ابن ہشام کی موجودہ کتاب سیرت میں نہیں ملتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن کثیر کو اس مروّجہ نسخے کے سوا دوسرا نسخہ بھی دستیاب تھا۔ مولانا مودودی نے متعدد دوسرے مآخذ کی روایات سے بھی اس کو مدلل کیا ہے جیسے طبری، ابن ہشام، ابن کثیر، ابن ماجہ، طبرانی (فی الاوسط)، امام احمد بن حنبل کے ساتھ وغیرہم بھی موجود ہے''۔ (۶۴)

موصوف کا یہ جملہ بڑا حقیقت آگیں ہے کہ ''اسلام میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جب نماز فرض نہ رہی ہو''۔

موجودہ دور کے ایک اہل حدیث سیرت نگار مولانا صفی الرحمٰن مبارک پوری نے لکھا ہے کہ ''ابتداً جو کچھ نازل ہوا، اُسی میں نماز کا حکم بھی تھا۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ نبی ﷺ اور اسی طرح آپ کے صحابۂ کرامؓ واقعۂ معراج سے پہلے قطعی طور سے نماز پڑھتے تھے''۔ اُنہوں نے حضرت اُسامہ بن زیدؓ کی موصولہ حدیث اور حضرت ابن عباس کی حدیث کہ ''یہ (نماز) اولین فرائض میں سے تھی'' شیخ عبداللہ کی مختصر السیرۃ کے حوالے سے بھی نقل کی ہے اور حضرات صحابہؓ کی روایت کے لئے ابن ماجہ کا ذکر اسی ثانوی کتاب سے دیا ہے۔ (۶۵)

ایسی روایات و احادیث کا انبار لگایا جا سکتا ہے لیکن سب کا جمع کرنا مقصود نہیں، دلائلِ قاطعہ فراہم کرنا مطلوب ہے۔ اور ان سے بلاشبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ پر رسالت کے ساتھ ہی تنزیلِ قرآنِ کریم کے معاً بعد ہی نماز فرض کر دی گئی تھی اور اس کی عملی تعلیم فرستادۂ الٰہی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے دی گئی تھی۔ اس بحث میں جو نکتہ خاص قابل توجہ ہے وہ یہ کہ یہ سب کی سب سیرت و تاریخ کی روایات ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ساتھ متعدد قابل اعتبار محدثین اور مروّج کتبِ صحاح کی بھی احادیثِ نبوی ﷺ ہیں۔ روایات و احادیث کا اتفاق اس کو اجماعی بنا دیتا ہے۔

اوّلین نماز کی ہیئت وساخت

حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے جو اوّلین نماز تنزیلِ قرآنِ کریم کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کو سکھائی گئی تھی اُس کی ساخت اور ہیئت کیا تھی؟ اس پر روایات میں دو اشارے ملتے ہیں جو اُس کی ساخت متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اوّل حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق وہ دو رکعت نماز تھی۔ اور دوم ابن کثیر کے مطابق دو رکعتیں چار سجدوں کے ساتھ تھیں۔ اس سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نماز کی وہی ہیئت اور ساخت تھی جو آج بھی ہے اور عہدِ نبوی ﷺ سے برابر اُسی طرح چلی آرہی ہے۔ یعنی تکبیرِ تحریمہ، قیام، رکوع، قومہ، سجدوں، سجدوں کے درمیان جلسہ، آخری رکعت میں تشہد کا قعود اور سلام وغیرہ کے تمام ارکان۔ قیاس ومنطق بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ نماز کی ہیئت بعد میں مختلف نہیں ہوسکتی تھی ورنہ اس کا ذکر ملتا یا اعتراض۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ بہت سی تفصیلات اور جزئیات بعد میں طے ہوئیں۔ کیونکہ نماز کا طریقہ بھی تدریجی اُصولِ اسلام پر مبنی ہے۔

بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو جب نماز کی تعلیم دی گئی تھی تو اُس وقت سورۂ فاتحہ اور قرآنِ مجید کا دوسرا حصہ (سورۂ اقرأ کی پانچ آیات کے سوا) نہیں اُترا تھا۔ اسی طرح تسبیحات رکوع وسجود اور تشہد ودرود وغیرہ کی تفصیلات بھی نہیں دی گئی تھیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہ تفصیلات اوّلین نمازوں میں موجود نہیں تھیں لیکن بقولِ حافظ ابن کثیر ''اصل الصلوٰۃ'' موجود تھی۔ قرآنِ مجید کی آیات کی تلاوت اور دوسری تسبیحات ووظائف کا وجود تو سابق انبیائے کرام کی، اور اُن کی اُمتوں کی نمازوں میں بھی نہیں تھا تو کیا اُن کی ''صلاۃ'' کا انکار کردیا جائے! اصل بات یہ ہے کہ نماز دوسرے ارکانِ دین کی مانند رفتہ رفتہ ارتقا پذیر ہوئی جیسا کہ اسلام کا قاعدہ اور اللہ تعالیٰ کی تمام چیزوں میں سنت ہے۔ شروع میں صرف نماز (صلاۃ) کی ''ہیئت'' سکھانی مقصود تھی۔ اس کی حکمت یہ معلوم ہوتی ہے کہ بندہ اپنے خالق کے حضور اپنی بندگی اور عبادت کا اظہار اپنے اعضاء وجوارح کے ساتھ کرے اور قلب میں حضوری کی کیفیت پیدا ہو۔ تلاوتِ قرآن مجید اور تسبیحات وغیرہ تو زبان سے اظہارِ عبودیت کی علامات ہیں اور ان کا درجہ ومقام اعضاء وجوارح کے کلی اظہارِ بندگی کے بعد ہی آتا ہے۔

اوّلین نماز کی تعداد

روایات میں اس پر اختلاف ہے کہ شروعِ اسلام میں نماز کتنے اوقات کی تھی۔ دن میں ایک

نماز تھی یا زیادہ۔ علمائے اسلام کا اس مسئلے پر روایات سے زیادہ اختلاف ہے بلکہ ان کے ہاں شدید ابہام اور تکراؤ پایا جاتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ اُنہوں نے بنیادی روایاتِ نماز کا لحاظ اپنی بحثوں میں نہیں کیا اور مختلف دوسری روایات سے بحث و اختلاف کا دروازہ کھول دیا۔ یا اپنے استنباطات و قیاسات سے اس اُصولی مسئلے اور عظیم ترین رکن کے بارے میں شدید اختلافات کو جنم دیا، حالانکہ معاملہ اتنا مشکل نہیں تھا۔

نماز کی تعلیم جبریلی والی روایات و احادیث سے بلاشک ثابت ہوتا ہے کہ شروع شروع میں صرف ایک نماز روزانہ فرض ہوئی۔ اور وہ تمام مآخذ کے مطابق صبح کی نماز تھی۔ عین ممکن ہے کہ وہ نماز چاشت رہی ہو جو قریش بھی ایامِ جاہلیت میں پڑھا کرتے تھے۔ کیونکہ اس میں تعینِ وقت حتمی نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ صرف نمازِ صبح رہی جو موجودہ اصطلاح میں نمازِ فجر کہلاتی ہے اور جس پر علما و فقہا کا اصرار ہے۔ بنیادی مآخذ میں بہرحال صرف ایک نماز روزانہ کا قرینہ اور صرف ایک نماز کی تعلیم کا ذکر پایا جاتا ہے۔ لہٰذا صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ صرف ایک وقت کی نماز فرض کی گئی تھی۔ اور وہ دو رکعات نماز تھی مع چار سجدوں کے۔

امام مزنی وغیرہ علما و فقہائے اسلام نے سورۂ غافر وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْأَبْكَارِ ○ (٦٦) سے جو استنباط کیا ہے کہ وہ بعد کا واقعہ معلوم ہوتا ہے اور اس پر مبنی روایات بھی بعد کے ارتقا کو بتاتی ہیں۔ روایت یہ ہے کہ اس حکمِ الٰہی کے بعد دو وقت کی نمازیں فرض ہوئیں۔ ایک فجر کی اور دوسری عصر کی۔ الفاظ ہیں:

> فرضت الصلاة ركعتين ركعتين..... وذكر المزني ان الصلاة قبل الاسراء كانت صلاة قبل غروب الشمس وصلاة قبل طلوعها ويشهد لهذا القول قوله سبحانه وسبح بحمد ربك بالعشي والابكار (غافر: ٥٥) وقال يحيىٰ بن سلام مثله، وقد قال بها طائفة من السلف منهم ابن عباس (٦٧)

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سورۂ غافر کے حکم کا نزول جب ہوا تو دو وقت کی نماز فرض ہوئی مگر اس کا نزول تو بعد کے زمانے کا ہے۔ اور حضراتِ صحابہؓ اور دوسرے سلف حضرات یعنی ابن عباس وغیرہ کا جو خیال ہے وہ اس حکم سے متعلق ہے نہ کہ اوّلین نمازِ جبریلی سے متعلق۔

فرضیتِ نماز اور محدثین کرام کا نقطۂ نظر

بعض اہل علم کا خیال ہے کہ محدثین کی ایک جماعت کے نزدیک واقعۂ معراج سے پہلے کوئی نماز فرض نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ اسی جماعتِ محدثین کے دوسرے اہل علم کا نظریہ ہے کہ اسراء ومعراج سے قبل ایک وقت نماز فرض کی گئی تھی، جبکہ ایک دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ایک وقت کی نہیں بلکہ دو وقت کی نماز فرض کی گئی تھی: یعنی نمازِ فجر اور نمازِ عصر۔ اس بحث میں بعض بزرگوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام محدثین کا اتفاق ہے کہ اسراء ومعراج سے قبل نماز سرے سے فرض ہی نہیں تھی۔ حالانکہ یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں ہے۔ بعض افراد کا خیال ہوسکتا ہے مگر اسے جماعتِ محدثین کا اتفاق کہنا بالکل غلط ہے۔

واقعۂ معراج واسراء سے قبل نماز کے فرض نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ فرضیت کا حکم نہیں تھا بلکہ اس کا دوسرا مفہوم ہے۔ محدثینِ کرام کے تبصروں اور جائزوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصلاً اس سے مراد نمازِ پنجگانہ کی فرضیت ہے جو اسراء میں ہوئی۔ قدیم ترین محدثین کرام میں حضرت عروہ بن زبیر اسدیؒ کا یہ تبصرہ کہ ''نماز کے فرض ہونے سے قبل حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوگئی''۔ اسی مطلب ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بہت عمدہ بات کہی ہے کہ اصل نماز تو حضرت خدیجہؓ کی زندگی ہی میں واجب ہوگئی تھی۔ (۶۸) ان کے شاگردِ عزیز امام زہری کے تبصرے میں ایک اور جملے کا اضافہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کے مدینے ہجرت سے قبل حضرت خدیجہؓ وفات پاگئیں۔ درحقیقت ''اصل نماز'' اور نمازِ پنجگانہ میں فرق نہیں کیا گیا۔ ورنہ ان امامانِ حدیث وسیرت کو ہم سے زیادہ معلوم تھا کہ ہجرتِ مدینہ سے تین سال قبل حضرت خدیجہؓ کی وفات ہوئی تھی اور ان کی وفات کے معاً بعد نمازِ پنجگانہ فرض ہوئی تھی اور اس سے زیادہ یہ کہ اس سے قبل رسولِ اکرم ﷺ برابر نو سال سے نماز پڑھتے چلے آرہے تھے۔ حافظ ابن کثیر نے موسیٰ بن عقبہ کی روایت امام زہری پر کہ حضرت خدیجہؓ نے نماز کی فرضیت سے قبل اسلام قبول کیا، کا مطلب یہی بتایا ہے۔ (۶۹) اور دوسرے امامانِ حدیث نے جہاں بھی لکھا ہے یہی لکھا ہے کہ ایک جماعت کا خیال ہے کہ اسراء سے قبل نماز فرض نہیں تھی، یہ تمام اہل حدیث کا اجماع نہیں، دوسرے وہ ان کے استنباط پر مبنی ہے، تیسرے بہت سی صحیح روایات سے ثابت ہے کہ اصل نماز فرض ہوچکی تھی لہٰذا محدثین کے عمومی تبصروں کو اسی نمازِ پنجگانہ یعنی اصلی موجودہ اسلامی نماز پر محمول کرنا چاہئے۔ مختلف فیہ رائے سے ہمیں کوئی اختلاف نہیں۔ بہرحال حافظ ابن سید الناسؒ نے قطعیت کے ساتھ لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل اسلام میں دو دو رکعت نماز

فرض کی تھی، ایک صبح اور دوسری شام کو پھر معراج کی رات پانچ نمازوں کی فرضیت ہوئی۔ (۷۰) ان قطعی بیانات، حتمی آثار اور پکے فتاویٰ کے بعد کسی شبہے کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ آغازِ اسلام میں یعنی رسالت نبوی ﷺ کے معاً بعد مکہ مکرمہ میں نماز فرض ہو چکی تھی۔

مکی اُمت کو تعلیم نماز

فرضیتِ نماز کا پہلا مرحلہ تو رسولِ اکرم ﷺ کی نماز تھی، جو آپ کو تعلیم جبرائیلی سے نزولِ قرآن کے معاً بعد ملی تھی۔ دوسرا مرحلہ مکی اُمتِ اسلامی کے افراد و طبقات کو نماز سکھانے کی تعلیم نبوی نے شروع کیا اور وہ بھی اُسی اولین زمانے کا ہے۔ تمام امامانِ سیرت اور متعدد ماہرین حدیث کی روایات میں یہ خبر تواتر کی حد تک پہنچتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تعلیم کے معاً بعد گھر کا رُخ کیا اور اپنی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجہ بنتِ خویلد اسدی رضی اللہ عنہا کو وضو اور نماز کی تعلیم دی۔ یہ نظری سے زیادہ عملی تعلیم تھی جیسا کہ روایات و احادیث کا اتفاق ہے اور تعلیم نبویؐ کے دن کا ہی واقعہ ہے، حافظ ابن سید الناس نے صراحت کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے دوشنبہ کے شروع دن میں اور حضرت خدیجہؓ نے دوشنبہ کے آخری حصے میں نماز ادا کی۔

فجاء رسول اللہ ﷺ خدیجة فتوضأ لها ليريها كيف الطهور للصلاة..... ثم صلى بها رسول اللہ ﷺ فصلت بصلوته (۷۱)

ابتدائے اسلام میں چونکہ اِکا دُکا افراد نے اسلام قبول کیا تھا، لہٰذا ان میں سے ہر ایک کے باب میں یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ اُنہوں نے اسلام لانے کے بعد رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اُن کو نماز کی تعلیم دی گئی۔ حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی رضی اللہ عنہ دس سالہ لڑکے تھے جب اسلام قبول کیا۔ روایات میں اُن کے نماز پڑھنے کا ذکر برابر ملتا ہے۔ ابن ہشام وغیرہ میں ہے کہ نماز کا وقت آتا تو رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ حضرت علیؓ بھی چلے جاتے اور مکہ کی وادیوں میں سے کسی ایک میں نماز پڑھتے تاکہ اُن کے والد ابو طالب اور تمام دوسرے چچا اور اُن کی پوری قوم نہ جان سکے اور وہ دونوں نمازیں پڑھتے تھے۔ (۷۲)

ابن اثیر نے ایک اور اہم اضافہ کیا ہے کہ حضرت علیؓ بقولِ خود دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سات سال قبل رسولِ اکرم ﷺ سے نماز پڑھتے چلے آ رہے تھے:

صلیت مع رسول اللّٰہ قبل الناس بسبع سنین، قال ابن عباس اوّل من صلی علی، وقال جابر بن عبداللہ بعث النبی ﷺ یوم الاثنین وصلی علی یوم الثلاثاء (۷۳)

روایات کے مطابق حضرت علیؓ نے بعثت/ تنزیلِ قرآن کے دوسرے دن منگل کو اسلام قبول کیا اور رسولِ اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی۔ حضرت علیؓ کے برادرِ اکبر حضرت جعفرؓ بھی حضرت علیؓ کے ساتھ پہلی نماز میں شریک ہو گئے تھے۔ (۷۴)

حضرت زید بن حارثہ کلبیؓ رسولِ اکرم اکے مولیٰ اور متبنیٰ تھے اور آپ کے خانوادے کے ایک مکین فرد بھی۔ اوّلین مسلمانوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ اُن کے بارے میں بھی متعدد روایات کا بیان ہے کہ حضرت علیؓ کے بعد وہ اسلام لائے اور نماز پڑھی۔ (۷۵)

اگرچہ ابن اسحاق و ابن ہشام وغیرہ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قبولِ اسلام کے بعد اُن کے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں کیا تاہم وہ مضمر ہے اور دوسری روایات و آثار میں اس کی وضاحت پائی جاتی ہے اور منطقی طور سے بھی یہ ممکن نہ تھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسے مخلص مسلم، رسولِ اکرم ﷺ کے سب سے قریبی بلکہ جانی دوست نے اسلام لانے کے بعد نماز نہیں پڑھی ہوگی۔ حافظ ابن کثیر کی روایت میں اُن کے نماز پڑھنے کی تصدیق ملتی ہے اور متعدد دوسری روایات و احادیث سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ (۷۶)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر یا اُن کی دعوت پر آٹھ صحابۂ کرامؓ نے اسلام قبول کیا تھا۔ بعض روایات میں چھ کا ذکر ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی تبلیغ سے بہت سے قریشی نوجوانوں اور بزرگوں نے اسلام قبول کیا تھا جیسا کہ متعدد روایات میں ہے۔ بہرحال ممتاز ترین صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین، حضرات عثمان بن عفان اُموی، زبیر بن عوام اسدی، عبدالرحمٰن بن عوف زہری، سعد بن ابی وقاص زہری اور طلحہ بن عبیداللہ تیمی وغیرہ کے قبولِ اسلام کے بعد یہ صراحت ضرور ملتی ہے کہ اُنہوں نے جب اسلام قبول کیا تو نماز پڑھی۔ (۷۷)

صحابۂ کرام کے قبولِ اسلام کی ایک علامت اور اُن کے اخلاص کا ایک نشان نماز پڑھنا بن گیا تھا۔ ابن سعد وغیرہ کے شخصی خاکوں میں اکثر ابتدائی صحابۂ کرامؓ کے ساتھ یہ علامتِ امتیاز ضرور بیان کی جاتی ہے اور نہ صرف قریشی مکی صحابہؓ کے بارے میں بلکہ عرب بدوی قبائل کے افراد کے قبولِ اسلام کے ضمن میں بھی۔ گویا قبولِ اسلام پختہ نہ ہوتا تھا جب تک نومسلم نماز نہ پڑھے۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے قبولِ

اسلام کے بعد اُن کے نماز پڑھنے کا ذکر متعدد اہل سیر نے کیا ہے۔(۷۸)

مکی اُمت کا تعاملِ نماز

رسولِ اکرم ﷺ کی مکی حیاتِ طیبہ میں متعدد روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ اور آپ کے صحابۂ کرامؓ پابندی سے روزانہ نماز پڑھا کرتے تھے، خواہ وہ ایک وقت روزانہ کی رہی ہو یا نمازِ فجر و نمازِ عصر کا روزانہ دوگانہ رہا ہو۔ ابن اسحاق وغیرہ کی روایات گزر چکی ہیں کہ نماز کا وقت آتے ہی رسولِ اکرم ﷺ مکہ کی وادیوں میں سے کسی کا رخ کرتے تھے اور صحابۂ کرامؓ کے ساتھ باجماعت نماز ادا فرماتے تھے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے بعض طبقات کے بارے میں صراحت آتی ہے کہ کسی نہ کسی وادی میں نماز کے اوقات میں باجماعت نماز ادا کیا کرتے تھے۔

اوّلین نمازوں میں رسولِ اکرم ﷺ کی وہ نماز باجماعت تھی جس میں مقتدی صرف دو تھے: حضرت علیؓ اور حضرت خدیجہؓ۔ اور اس کے عینی شاہد رسولِ اکرم ﷺ کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی کے علاوہ ایک قبائلی عرب حضرت عفیف کندیؓ تھے۔(۷۹)

بعض روایات میں آتا ہے کہ تین مقتدی تھے، مذکورہ بالا دو کے علاوہ حضرت بلال حبشیؓ یا ایک غلام جو اوّلین مسلمانوں میں سے تھے۔ لیکن یہ روایات حضرت عمرو بن عبسہ سلمیؓ کے قبولِ اسلام سے متعلق ہیں۔ اُن کی ایک روایت میں صرف حضرات ابوبکر و بلالؓ کے قبولِ اسلام کا ذکر ہے۔(۸۰)

حضراتِ صحابۂ کرامؓ نے بعض نمازیں رسولِ اکرم ﷺ کی امامت کے علاوہ اپنے میں سے منتخب کردہ کسی امام کی اقتدا میں بھی پڑھیں اور اُن کا مقامِ ادائیگی مکہ کی وادیوں میں سے کوئی ایک وادی ہوتی تھی۔ ابن اسحاق نے ایک روایت میں بیان کیا ہے کہ صحابۂ کرامؓ کی ایک جماعت میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ موجود تھے۔ وہ مکہ کی ایک وادی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ کفار و مشرکین کی ایک جماعت نے اُن کو دیکھ لیا اور سخت سُست کہا، جب مار پیٹ پر آمادہ ہو گئے تو حضرت سعدؓ نے دفاع میں ایک مشرک کی اُونٹ کی ہڈی سے سرکوبی کر ڈالی۔ اُس کے سر سے خون بہنے کو اسلام میں اوّلین خوں ریزی کہا گیا ہے۔(۸۱)

نبوی تعاملِ نماز

سیرت کے علاوہ حدیث کی روایات سے تواتر کی حد تک ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ بعثت کے بعد سے نماز ادا فرمایا کرتے تھے۔ خانۂ اطہر کے علاوہ مکہ کی وادیاں آپ ﷺ کی مساجد تھیں

اوران کے علاوہ صحن حرم بھی نبوی سجدہ گاہ تھا۔ان میں دن کی نمازیں بھی تھیں اور رات کی نمازیں بھی۔نمازِ تہجد کی فرضیت یا مسنونیت پر بحث بعد میں آئے گی لیکن صلوٰۃ اللیل کا نبوی معمول شروع سے رہا تھا۔اور یہ نماز اوّلین شب کی بھی ہوسکتی ہے کہ روایات سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔چاشت کی نماز وغیرہ کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔ان کے علاوہ دوسری نبوی نمازوں کے معمول کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے۔

۱۔مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد ۶۱۶ء میں اکابرِ قریش سے لڑ جھگڑ کر کعبے کے زیرِ سایہ مسجدِ حرام میں نماز پڑھنے کا حق تمام مسلمانوں کے لئے حاصل کیا اور رسولِ اکرم ﷺ سمیت سب نے نماز پڑھی۔یہ معاصر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی رضی اللہ عنہ کی عینی شہادت ہے۔(۸۲) ابن اسحاق وابن ہشام کی روایات میں اختصار پایا جاتا ہے۔دوسری روایات میں کافی تفصیل ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ تمام مسلمانوں کے ساتھ مسجدِ حرام تشریف لے گئے اور وہاں باجماعت نماز ادا فرمائی اور یہ پہلی اسلامی نماز تھی جو علانیہ باجماعت مسجدِ حرام میں کعبے کے پاس پڑھی گئی۔

۲۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی دوسری روایات میں بھی رسولِ اکرم ﷺ کے صحنِ کعبہ میں نماز ادا کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ابن اسحاق کی دوسری روایت کے مطابق حضرت عمرؓ طواف کے ارادے سے مسجد پہنچے تو رسولِ اکرم ﷺ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔

فجئت المسجد اريد ان اطوف بالكعبة، فاذا رسول الله ﷺ قائم يصلي۔(۸۳)

۳۔حافظ ابن سید الناس نے اس ضمن میں ایک اور روایت نقل کی ہے جو ابن اسحاق کی مذکورہ بالا روایت کے مطابق اُن کے اپنے بیان پر مبنی ہے۔حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے معارضے کے لئے گئے تو آپؐ کو مسجد میں نماز میں سورۂ حاقہ پڑھتے ہوئے سنا اور سخت متاثر ہوئے۔

خرجت العرض رسول الله ﷺ قبل ان اسلم فوجدته قد سبقني الى المسجد فقمت خلفه فاستفتح سورة الحاقة فجعلت اتعجب۔(۸۴)

۴۔مختلف احادیث میں رسولِ اکرم ﷺ کے صحنِ کعبہ میں مختلف اوقات میں نماز پڑھنے کی صراحت آتی ہے۔امام بخاری اور دوسرے محدثین واصحابِ سیر نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مسجدِ حرام میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ دشمنِ جان وایمان عقبہ بن ابی معیط اُموی آیا اور اپنی

چادر رسولِ اکرم ﷺ کی گردن مبارک میں ڈال کر گلا گھونٹنے لگا تو حضرت ابوبکرؓ نے آ کر آپ کو پھندے سے نکالا اور اس دشمن کو دھکا دے کر ہٹایا:

رأیت عقبة بن ابی معیط جاء الی النبی ﷺ وھو یصلی، فوضع رداء ہ فی عنقہ فخنقہ بہ خنقا شدیدا، فجاء ابوبکر حتی دفعہ عنہ (۸۵)

امام بخاریؒ ہی کی ایک اور حدیث ایک دوسرے واقعۂ نمازِ نبویؐ سے متعلق ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ صحن کعبہ میں نماز ادا فرما رہے تھے کہ اکابرِ قریش نے اسی دشمن جان و ایمان عقبہ اموی کے ذریعے آپ کے سرِ اقدس پر اوجھڑی رکھوا دی۔ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو انہوں نے آپ ﷺ کو اس اذیت سے چھٹکارا دلایا اور پھر آپ نے قریشی اکابر کو بددُعا دی۔ یہ روایت بھی ایک عینی شاہد حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ ہے اور امام بخاریؒ نے اس کو بہت سے ابواب میں بیان کیا ہے۔ (۸۶)

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ایک روایت یہ بیان کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مسجدِ حرام میں کعبے کے پاس نماز ادا فرما رہے تھے۔ جب فرعونِ اُمت ابوجہل مخزومی نے آپ کو قتل کرنے کے ارادے سے پیش قدمی کی مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کی حفاظت فرمائی۔ یہ روایت دوسرے امامانِ حدیث و سیرت نے بھی بیان کی ہے اور ان سب کی روایات میں آپ ﷺ کے نماز پڑھنے کی صراحت ہے۔ (۸۷)

گھریلو مساجد میں نماز

بہت سی روایات کا اتفاق ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اپنے خانۂ مبارک کی مسجد میں بھی نمازیں ادا فرماتے تھے۔ بسا اوقات آپ کی تلاوتِ قرآن سننے کے لئے اکابرِ قریش بھی جمع ہو جاتے۔ وہ بالعموم رات کی نمازوں میں تلاوتِ نبوی سنا کرتے تھے۔ ابن اسحاق نے تین بڑے قریشی اکابر ابوسفیان اموی، ابوجہل مخزومی اور اخنس ثقفی کے تلاوتِ نبوی ﷺ سننے کا واقعہ بیان کیا ہے:

خرجو اللیلة لیستمعوا من رسول اللہ ﷺ، وھو یصلی من اللیل فی بیتہ۔ (۸۸)

اور ان تینوں نے تین مسلسل راتوں میں نماز کی تلاوتِ نبوی سنی تھی اور بعد میں معاہدہ کر کے

نہ سننے کی قسم کھائی تھی۔ اور یہ صرف ایک واقعہ نہیں بہت سی روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ برابر اپنی گھریلو مسجد میں پورے مکی عہد میں نمازیں پڑھتے رہے۔ حافظ ابن سید الناس نے ایک روایت آیتِ کریمہ: **ولا تجھر بصلوتک ولا تخافت بھا** (۸۹) کے سببِ نزول کے بارے میں نقل کی ہے۔ اس میں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ جب بلند آواز سے نماز میں تلاوت فرماتے تو قریش کے لوگ تتر بتر ہوجاتے اور سننے سے گریز کرتے مگر جب آپ نمازوں میں قرأتِ قرآن آہستہ فرماتے تو وہ چھپ چھپا کر سنا کرتے تھے۔ (۹۰)

رسولِ مکرم ﷺ کی اتباع میں صحابۂ کرامؓ نے بھی اپنی گھریلو مسجدیں تعمیر کرلی تھیں جن میں وہ نمازیں پڑھا کرتے تھے۔ یہ ایک عمومی واقعہ اور حقیقتِ ثابتہ ہے۔ بعض صحابۂ کرامؓ کی مساجد اور ان میں نمازیں ادا کرنے کا واضح ذکر ملتا ہے۔

۱۔ مسجدِ حضرت خدیجہؓ: حضرت خدیجہؓ اور اُن کی بناتِ مطہرات اپنی گھریلو مسجدوں میں نمازیں ادا کیا کرتی تھیں جیسا کہ اوّل نماز کا ذکر آچکا ہے۔

۲۔ مسجدِ ابوبکر صدیقؓ: خانۂ صدیقی میں مسجد اور اس میں نماز وتلاوت کا ذکر ابن الدغنہ کی جوار کے ضمن میں ملتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی مسجد محلّہ بنوجمح میں اُن کے احاطے کے دروازے پر تھی، وہ جب اس میں نماز پڑھتے تو روتے تھے کہ بہت رقیق القلب شخص تھے۔ (۹۱)

۳۔ مسجدِ عمار بن یاسر بقول بلاذری وہ مکہ مکرمہ کی اوّلین مسجد تھی اور وہ اس کے اوّلین نمازی تھے۔ اول من اتخذ مسجدا فی بیتہ یصلی فیہ. (۹۲)

یہ صرف چند مسجدوں کا ذکر ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مکی صحابۂ کرامؓ کے گھروں میں اُن کی مسجدیں تھیں جہاں وہ نمازیں پڑھا کرتے تھے، مرد حضرات تو باہر شعابِ مکہ اور حرم مکہ میں بھی نمازیں ادا کرلیا کرتے تھے مگر خواتینِ مکہ تو بلاشبہ اپنی گھریلو مسجدوں میں ہی فریضہ ادا کیا کرتی تھیں، جیسا کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ (۹۳)

ابتدائے رسالت میں نماز کے احکام

قرآنِ مجید کی اوّلین تنزیل کی پہلی صبح ہی سے یعنی ۲۷ رمضان ۴۱ نبوی (مطابق اکتوبر ۶۱۰)

کے دن سے نماز کا آغاز ہوا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے رسولِ اکرم کو آ کر وضو سکھایا اور نماز کی عملی تعلیم دی۔ روایاتِ سیرت اور آرائے محدثین کے مطابق یہ ایک وقت کی نماز تھی جو دو رکعتوں پر مشتمل تھی اور بقول ابن کثیرؒ ان میں چار سجدے تھے، یعنی ہر ایک رکعت میں دو سجدے۔ ان کے علاوہ دوسرے ارکان و اعمالِ نماز کا ذکر نہیں ملتا۔ البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے اور وہ صحیح بھی ہے کہ نماز میں تکبیرِ تحریمہ، قیام اور دورانِ قیام ہاتھوں کا باندھنا، رکوع، دو سجدوں کے درمیان جلسہ، آخری رکعت میں تشہد وغیرہ کا قعود اور سلام کے ذریعے نماز ختم کرنے کا طریقہ وغیرہ بھی شامل تھا۔ اسی طرح دورانِ قیام قرأتِ قرآن اور رکوع و سجود وغیرہ کی تسبیحات بھی۔ ممکن ہے کہ تلاوتِ قرآن اور تسبیحاتِ رکوع و سجود و قومہ وغیرہ کی تعلیم کچھ دیر بعد ہوئی ہو مگر ہوئی ضرور تھی۔ اور نماز کی وہی ہیئت تھی جو آج یا اسراء و معراج کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ان احکامِ نماز پر مزید بحث و تحقیق پنجگانہ نماز کی فرضیت کے بعد کے زمانے میں کریں گے۔ لیکن زمانی ترتیب کے لحاظ سے بعض شرائطِ نماز اور احکام پر بحث یہیں کرنی ہے۔

طہارتِ مقام کا مسئلہ

نماز کے صحیح ہونے کی شرائط میں سے کپڑوں کی پاکی، جسم کی طہارت اور وضو کی فرضیت کا بیان ہو چکا ہے اور ثابت ہو چکا ہے کہ ان تین شرائط کی باقاعدہ تعلیم بھی قرآنی تعلیم کے علاوہ تربیتِ جبرائیلی میں داخل و شامل تھی۔ اسی میں جسم و لباس کی طہارت پر قیاس کر کے مقام و مکانِ نماز کی پاکی بھی شامل کی جا سکتی ہے کہ وہ منطقی طور سے بھی ضروری ہے اور عقلِ سلیم میں بھی آتی ہے کہ پاک جگہ ہی پر نماز جیسی عبادت کی جا سکتی ہے خصوصاً جبکہ جسم و لباس کی طہارت کے علاوہ وضو کی فوری طہارت بھی لازمی قرار دی گئی ہو۔ بعض علمائے اسلام نے سورۂ مدثر: ۴ سے اس کا قیاس بھی کیا ہے اور صحیح کیا ہے۔ (۹۴)

قبلے کا تعین

نماز کی صحت کی شرائط میں سے ایک قبلہ بھی ہے کہ نمازی کا رُخ صحیح قبلے کی صحیح سمت و رُخ میں ہو۔ روایاتِ سیرت ہی میں نہیں احادیثِ محدثین میں بھی اس موضوع پر پکے ثبوت، پختہ شواہد اور قطعی معلومات دستیاب ہیں۔ منطقی طور سے اور عقلی استدلال کی بنا پر یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے جب رسولِ اکرم ﷺ کو اولین نماز کی تعلیم دی تھی تو کسی خاص سمت میں ہی اپنا رُخ کیا ہوگا اور رسولِ اکرم ﷺ کو اسی جانب اپنا روئے مبارک کرنے کو کہا ہوگا۔ وہ سمتِ قبلہ کیا تھی؟ بعض اِکا دُکا

روایات میں جو حوالہ آتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کیا گیا تھا۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ امام طبرانی کی ایک روایت ہے کہ نبی ﷺ نے شروع میں کعبے کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی پھر مکہ ہی میں بیت المقدس کی طرف قبلہ کر دیا اور تین سال تک مکہ میں اُدھر رخ کیا۔ پھر مدینے میں سولہ ماہ تک۔

صلی النبی ﷺ اول ماصلی الی الکعبة، ثم صرف الی بیت المقدس وھو بمکة فصلی ثلاث جحج ثم ھاجر فصلی الیه بعد قدومه المدینة ستة عشر شهراً۔ (۹۵)

بعد کی واضح روایات اور صحیح احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو شروع ہی سے غالباً حضرت جبریل علیہ السلام کی اولین تعلیمِ نماز کے وقت سے ہی قبلہ بتا دیا گیا تھا۔ اور وہ بیت المقدس کی جانب تھا، یعنی اسلام کے قبلۂ اوّل کی طرف۔ کعبے کی طرف اولین نماز میں رُخ کرنے کا معاملہ روایت واستدلال دونوں کے خلاف جاتا ہے کہ ایک آدھ یا چند دنوں تک تو رُخ خانۂ کعبہ کی طرف کیا جائے اور پھر کچھ دنوں بعد بیت المقدس کی طرف رُخ موڑنے کو کہا جائے۔ یہ تو تحویلِ قبلہ کا معاملہ ہو جاتا ہے۔ طبرانی کے علاوہ طبری کی اسی معنی کی روایت کا حوالہ حافظ ابن حجر نے دیا ہے مگر سوءِ خرالذکر کے راوی و روایت کو ضعیف بھی بتایا ہے۔ ایسی روایات کے علاوہ اس کا اشارہ وقرینہ بھی کسی جگہ نہیں ملتا۔ لہٰذا خانۂ کعبہ کی طرف رخ کو بیان کرنے والی روایت صحیح نہیں ہو سکتی، اور اس کی تردید حضرت ابن عباسؓ کی ایک اور صحیح روایت اور دوسری احادیث و روایاتِ سیرت سے ہو جاتی ہے۔ حالانکہ حافظ ابن حجر نے تطبیق کی کوشش کی ہے۔ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے اور دورانِ عبادت اسے قبلہ بنانے کا حکم بلاشبہ وحیٔ الٰہی پر مبنی تھا۔ خواہ وہ حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تعلیم کے ذریعے ہوا ہو یا وحی والقائے ربانی کی دوسری صورتوں کے ذریعے، یا آپ ﷺ نے از خود اختیار کیا ہو یعنی اپنے اجتہاد سے۔ حافظ ابن حجر نے اجتہاد والی بات کی تردید دوسری روایات میں فراہم کی ہے مگر وہ ایسی غلط بھی نہیں کہ اجتہاد بھی تو نبوی حکمت پر مبنی تھا۔ جس معاملے میں آپ ﷺ کو ہدایتِ ربانی اور وحیٔ الٰہی واضح، بیّن اور حتمی نہیں ملتی تھی اس میں وہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیثِ مبارک کے مطابق اہل کتاب کی پیروی پسند فرماتے تھے۔ خواہ آپ ﷺ دل سے خانۂ کعبہ کو قبلہ بنانا چاہتے ہوں۔ جیسا کہ قرآنِ مجید میں سورۂ بقرہ: ۱۴۴ کی تحویلِ قبلہ کی الٰہی صراحت سے ثابت ہوتا ہے۔ قبلۂ اوّل کی تعیین بہرحال وحیٔ ربانی پر مبنی تھی:

کان رسول اللّٰہ ﷺ صلی نحو بیت المقدس وکان رسول اللّٰہ

ان یوجد الی الکعبۃ۔ (۹۶)

قرآنِ مجید کی سورۂ بقرہ کی اس سے پہلی آیتِ کریمہ وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ (۹۷) سے بھی ان دونوں حقیقتوں کا علم ہوتا ہے: ایک یہ کہ بیت المقدس کا قبلہ مقرر ہونا منجانب الٰہی تھا اور اس کی حکمت یہ تھی کہ رسولِ اکرم ﷺ کی غیر مشروط اتباع اور اپنی مرضی کے خلاف بھی پیروی کی جائے کہ یہی دو شرطیں تو اخلاص و ایمان اور تسلیم و رضا کی ہیں۔ دوسرے یہ کہ بیت المقدس کا قبلہ بنانا لوگوں پر خاص طور پر قریش مکہ اور دوسرے عرب عصبیت والوں پر خاصا شاق تھا کہ وہ ان کا قبلہ رہا تھا۔ رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے مخلص مکی اور دوسرے صحابہؓ نے بلا چون و چرا اپنی پسند کے خلاف ہونے کے باوجود اسے قبول کر لیا تھا۔ تاہم حضرت براء بن معرور خزرجیؓ جیسے عرب حمیت والے بھی بعض صحابہ کرامؓ تھے جو مشکل سے مانے تھے کہ اتباعِ رسولؐ ایمان کے لئے لازمی تھی۔ (۹۸)

متعدد احادیثِ نبویؐ میں بھی واضح بیان ملتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں اوّل دن سے بیت المقدس قبلۂ نبوی رہا تھا۔ اور پورے تیرہ سالہ مکی دورِ حیات میں (۶۱۰-۶۲۲ء) میں شام کی ہی طرف مسلمانوں کا قبلہ رہا، بلکہ اس کے کچھ عرصے بعد تک۔ حافظ ابن حجر نے امام احمدؒ کی ایک روایت حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ مکہ مکرمہ میں بیت المقدس کی جانب رُخ کر کے نماز پڑھا کرتے تھے حالانکہ کعبہ آپ کے سامنے ہوتا تھا۔ (۹۹)

حافظ ابن کثیر اور دوسرے محدثین کرام کا واضح بیان ہے کہ اس باب میں بہت سی احادیث ہیں اور اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو بیت المقدس کے صخرہ کی جانب رُخ کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور آپؐ مکے میں دونوں رکنوں کے درمیان اس طرح نماز پڑھتے کہ سامنے تو کعبہ ہوتا مگر آپ کا اصل قبلہ صخرۂ بیت المقدس ہوتا تھا۔ (۱۰۰)

روایاتِ سیرت میں تقریباً اجماع پایا جاتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں رسولِ اکرم ﷺ اور مکی مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا اور وہ پورے تیرہ سال تک رہا۔ ان روایات کا تعلق مختلف زمانوں سے ہے جو اس کو واقعاتی حقیقت بناتا ہے۔ ابن اسحاق کی روایت میں بعض احادیثِ نبوی ﷺ کے مطابق بیان ملتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ جب مکہ مکرمہ میں نماز ادا فرماتے تھے تو آپ ﷺ کا قبلہ شام کی طرف ہوتا اور آپ جب بھی نماز پڑھتے تو رکن یمانی اور حجرِ اسود کے درمیان پڑھتے اور کعبے کو اپنے اور شام کے درمیان

بنا لیتے تھے۔(۱۰۱)

ابن اسحاق نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبولِ اسلام کی دوسری روایت میں بھی اسی بیان کو دُہرایا ہے اور وہ حضرت عمرؓ کے مشاہدے پر مبنی اور اُن کی روایت سے بیان کیا ہے۔ اسے ایک عینی گواہ کی شہادت پر مبنی بیان کہا جاسکتا ہے:

فجئت المسجد اريد ان اطوف الكعبة، فاذا رسول اللّٰه قائم يصلي، وكان اذا صلى استقبل الشام، وجعل الكعبة بينه و بين الشام، وكان مصلاه بين الركنيين، الركن الاسود والركن اليماني۔ (۱۰۲)

ان روایات میں ایک فقرہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نماز کے دوران کعبۂ مکرمہ کو اپنے سامنے رکھتے تھے حالانکہ قبلہ آپ کا شام کی طرف تھا، گویا کہ آپ اپنی پسند اور عرب سائیکی کی رعایت بھی فرمالیا کرتے تھے۔ اس میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی لیکن ہے۔ اول تو رسولِ اکرم ﷺ ایسا کوئی حیلہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ آپ کے منصبِ نبوت اور شانِ عبودیت کے بالکل خلاف ومنافی تھا۔ دوسرے خانۂ کعبہ میں تو اس کی رعایت اور مسجدِ حرام میں اس کی توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ وہاں آپ دونوں مقاماتِ مقدسہ کو قبلہ نما بنا لیتے تھے لیکن مسجدِ حرام کے باہر، اپنے خانۂ اطہر میں، غارِ حرا میں، مکے کی وادیوں میں اور دوسرے مقاماتِ مکہ وغیر مکہ میں تو ان کی رعایت ناممکن تھی۔ خاص طور سے ان مقامات میں جو کعبۂ مقدسہ اور بیت المقدس کے درمیان میں جانبِ شمال واقع تھے۔ ظاہر ہے کہ وہاں قبلہ صرف ایک تھا۔ لہٰذا کعبے کو سامنے رکھنے کا فقرہ محض برائے تطبیق ہے اور ہمارے علما و محدثین کرام کی عادت اور سنت کے عین مطابق ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مکہ مکرمہ میں قبلہ صرف بیت المقدس تھا اور رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرام رضوان اللہ اجمعین اسی کی پاسداری فرماتے تھے۔(۱۰۳)

نمازِ پنج گانہ کی فرضیت

ابتدائے تنزیلِ قرآن سے معراجِ نبوی تک مکی عہدِ نبوی کا عرصہ مشہور روایت کے مطابق تقریباً نو سال سے زیادہ کا ہے۔ دراصل اسراء و معراج کی تاریخ میں علما و محدثین کا شدید اختلاف پایا جاتا ہے جس سے یہاں بحث نہیں ہے۔(۱۰۴) بعض روایات کے مطابق بعثت کے بارہ سال بعد معراج کا

واقعہ پیش آیا۔ گویا ۶۱۰ء سے ۶۲۱ء تک کا طویل عرصہ گزرا۔ اس دوران صرف صبح وشام دو وقت کی نمازیں ہی فرض رہیں اور وہ بھی دو دو رکعتیں، یعنی نمازِ فجر اور نمازِ عصر کی دو، دو رکعتیں البتہ رات کی نماز بھی مسنون ہو چکی تھی۔

یہ طویل عرصۂ اسلام بھی اُس نظریے کی کاٹ کرتا ہے جس کے مطابق مکی عہد میں اسراء و معراج سے قبل کوئی نماز فرض نہیں ہوئی تھی۔ اوّل تو یہ تصور ہی ناقابلِ قبول ہے کہ اسلام کے اس تعمیری دور اور ارتقائی زمانے میں، اور وہ بھی جب اسلام کی دینی بنیاد رکھی جا رہی تھی، نماز کی فرضیت نہیں ہوئی تھی۔ دوسرے واقعاتی شہادتوں کا تواتر ثابت کرتا ہے کہ اس دوران رسولِ اکرم ﷺ نہ صرف بنفسِ نفیس نماز ادا فرماتے تھے بلکہ اسلام کے ایک عظیم ترین رکن کی حیثیت سے اس کی ادائیگی کا حکم بھی دیتے تھے اور صحابۂ کرامؓ سے اس کی تعمیل کراتے تھے۔ تیسرے یہ کہ نماز قبولِ اسلام کی علامت اور مسلمان ہونے کی نشانی بن گئی تھی۔ چوتھے رسولِ اکرم از خود اتنے بڑے فرض کا فیصلہ نہیں فرما سکتے تھے وہ یقیناً وحیٔ الٰہی پر مبنی تھا اور وہ بھی حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے آیا تھا۔ پانچویں یہ کہ غیر مسلم دشمن تک اس کو رکنِ اسلام اور دعوتِ نبویؐ کا اہم ترین جزو گردانتے تھے جیسا کہ حدیثِ ہرقل میں حضرت ابوسفیان اُموی کا تبصرہ ہے یامرنا بالصلوٰۃ (۱۰۵) چھٹے تدریجی قانونِ ارتقا کا تقاضا تھا کہ پہلے ایک پھر دو نمازیں فرض ہوں۔ اور جب اُمت کی طبائع عادی ہو جائیں تو رات دن کی کامل نمازوں کا حکم آئے جیسا کہ معراج کے بعد آیا۔ اور ساتویں حکمتِ الٰہی کا یہی تقاضا تھا۔

علمائے محدثین اور پوری اُمتِ اسلامی کا اجماع ہے کہ پانچ نمازوں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء کی فرضیت اسراء و معراج کے واقعے کے دوران ہوئی اور آسمان پر اللہ تعالیٰ نے براہِ راست رسولِ اکرم ﷺ کو ان پانچ نمازوں کے پڑھنے کا حکم دیا۔ وہ شروع میں پچاس نمازیں تھیں مگر درخواستِ نبویؐ پر پانچ کو پچاس کے برابر کر دیا گیا: **ففرض اللّٰہ علیٰ اُمتی خمسین صلاۃ، فقال ھی خمس وھی خمسون** اور حکمتِ الٰہی یہی تھی کہ اسلام کے عظیم ترین رکن کا حکم براہِ راست زبانِ الٰہی سے رسولِ اکرم ﷺ دلا کر دیا جائے۔ (۱۰۶)

پانچ نمازوں کا ارتقا

معراجِ نبوی ﷺ کے بعد نماز پنج گانہ ہوئی تو بعض بہت ضروری، اہم، دُوررس اور مستقل

تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں۔ ان کا بالعموم تجزیہ نہیں کیا جاتا۔ محدثین کرام، مؤرخینِ اسلام اور سیرت نگارانِ رسول ﷺ اس باب کی بعض روایات واحادیث بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں اور مکی دورِ حیات میں ان انقلابی تبدیلیوں اور ان کے مستقل نتائج واثرات کا ذکر نہیں کرتے، جو اُس عظیم الشان امرِ الٰہی نے پیدا کیا تھا۔ مثال کے طور پر حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حوالے سے یہ روایت تو بیان کی جاتی ہے کہ نمازوں کی رکعات دو دو ہی رہیں۔ امام بخاریؒ نے واقعۂ معراج کے ضمن میں مذکورہ بالا حدیث نقل کی ہے اور دوسرے امامانِ حدیث وسیرت نے بھی۔ (۱۰۷) لیکن اسی فرضیتِ نمازِ پنجگانہ سے متعلق اور بھی روایات واحادیث ملتی ہیں، اُن کا ذکر بھی بالعموم نہیں کیا جاتا تو تجزیہ کیونکر ہو؟

رکعاتِ مغرب کی تعداد

چار نمازوں فجر، ظہر، عصر، عشا کی حد تک دو رکعتوں کی روایت صحیح ہے مگر مغرب کے لئے صحیح نہیں۔ ظاہر ہے کہ اسراء ومعراج سے قبل بھی ایک یا دو وقت کی نمازوں پر حضرت عائشہؓ کی حدیث کے اولین مذکورہ حصے کا اطلاق ہوتا ہے۔ اُس وقت تک مغرب کی نماز فرض نہیں ہوئی تھی۔ لہٰذا اُس کی رکعتوں کا فرق واضح نہ ہونا منطقی اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ ایسی تمام روایات واحادیث میں قیام و حضور کے دوران دو دو رکعتوں کے اضافے کا ظہر وعصر وعشاء میں ذکر ملتا ہے اور قصر کا بھی مگر مغرب کی رکعتوں کی تعداد کا فرق نہیں بیان کیا جاتا۔ بہرحال متعدد جامع تجزیہ نگاروں نے اس فرق کو محسوس کیا اور روایات واحادیث جمع کر کے اُن پر بحث کی ہے۔ ان میں ابن حجر بہت اہم ہیں جو اپنے پیشرو حضرات کی تمام روایات کو جمع کر کے تجزیہ کرتے ہیں۔ انہوں نے امامِ سیرت ابن اسحاق کی ایک روایت نقل کی ہے جس کے مطابق مغرب میں تین رکعتیں واقعۂ معراج میں فرض کی گئی تھیں: **حدثنی صالح بن کیسان بھذا الاسناد الا المغرب فانھا کانت ثلاثاً** مزید صراحت کی ہے کہ امام نے اپنے طریق سے اسی روایت کو بیان کیا ہے۔ حافظِ موصوف نے اس پر اپنی رائے بھی لکھی ہے کہ ''تمام دلائلِ سابقہ پر نظر کرنے کے بعد مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسراء کی رات میں تمام نمازوں کی دو دو رکعات مقرر کی گئیں سوائے مغرب کے''۔ اُنہوں نے امام ابن خزیمہ، ابن جان اور حافظ بیہقی کا حوالہ بھی دیا ہے۔ پھر نمازِ مغرب کی تین رکعتوں کی حکمت یہ بتائی ہے کہ وہ دن کی نمازِ وتر ہے، جیسے کہ رات کی وتر میں تین رکعتیں مقرر کی گئی ہیں:

والذی یظھر لی وبہ تجتمع الادلۃ السابقۃ، ان الصلوات

فرضت ليلة الاسراء ركعتين ركعتين الاالمغرب، كماروى ابن خزيمة و ابن جان والبيهقي من طريق الشعبي عن مسروق عن عائشةؓ، وصلاة المغرب لانها وتر النهار۔ (۱۰۸)

حافظ ابن سید الناس نے نمازِ پنج گانہ کی رکعات پر علما وفقہا کے اختلاف سے بحث کی ہے۔ اُن کے مطابق ایک طبقے کا خیال ہے کہ اوّل اول دو رکعات ہی فرض کی گئیں پھر حضر کی نماز میں اضافہ کر کے چار کی تکمیل کر دی گئی اور سفر کی نمازِ قصر دو ہی پر قائم و دائم رہی۔ یہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے علاوہ شعبی، میمون بن مہران اور محمد بن اسحاق وغیرہ کی روایت ہے۔ اُن کے دوسرے طبقے کا مسلک ہے کہ اوّلین فرضیتِ نماز میں چار رکعات ہی فرض ہوئی تھیں، سوائے مغرب کے جس کی تین رکعات تھیں اور فجر کی دو رکعتیں ہی تھیں۔ یہ امام حسن بصری، نافع بن جبیر بن مطعم اور ابن جریج کا خیال ہے۔ تیسرے طبقے کا خیال ہے کہ اوّل روز ہی سے حضر میں چار رکعات اور سفر میں دو رکعات فرض کی گئی تھیں۔ یہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا جاتا ہے۔

حافظِ موصوف نے مزید بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مکہ میں اول اول دو رکعات آغازِ دن میں فرض کی گئیں اور دو اس کے آخر میں اور اس باب میں حضرت عائشہؓ کی حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو دو رکعتیں فرض فرمائی تھیں پھر حضر کی نمازوں میں اضافہ فرمایا۔ اس خیال کو امام ابو اسحاق حربی کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ حافظ موصوف نے اس پر ابن عبدالبر کا نقد بھی نقل کیا ہے کہ امام حربی نے حضرت عائشہؓ کی حدیث سے جو استناد کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ ''الصلاۃ'' میں جو الف لام ہے وہ اس حدیث کو نمازِ پنج گانہ سے متعلق بتاتا ہے کہ معرفہ معہود کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حافظِ موصوف نے ایک اور حدیث حضرت عائشہؓ سے نقل کی ہے کہ نمازِ حضر ہو یا نمازِ سفر دو دو رکعات ہی اول اول فرض ہوئی تھیں اور جب رسولِ اکرم ﷺ کا مدینے میں قیام ہوا تو نمازِ حضر میں دو رکعتوں کا اضافہ کر دیا گیا اور نمازِ فجر کو طویل قرأت کے سبب اور نمازِ مغرب کو وترِ نہار کے سبب اپنی حالت پر باقی رکھا گیا۔ (۱۰۹)

ابن سید الناس کی اس مفصل و مدلل بحث میں اور بھی بعض اہم نکات ہیں جن سے ہمیں سرِ دست بحث نہیں، لیکن یہ تبصرہ کئے بغیر چارہ نہیں کہ یہ پوری بحث نمازِ حضر اور نمازِ قصر کے سیاق و سباق میں کی گئی ہے۔ مکی اسلام میں اس تفریق کا پتہ نہیں چلتا۔ اور صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ چار نمازوں میں صرف دو دو رکعات ہی فرض ہوئی تھیں اور نمازِ مغرب میں تین رکعات۔ باقی بحث ارتقائے نماز سے متعلق ہے۔

اوقاتِ پنج گانہ کا تعین

نمازِ پنج گانہ کی فرضیت کے بعد اُن کے اوقات کا تعین کیا گیا جس طرح اس سے قبل ایک یا دو نمازوں کا وقت مقرر ہوا تھا۔ قرآنِ مجید میں بلاشبہ پہلے ایک یا دو نمازوں کے اوقات کا حوالہ ملتا ہے اور اسی طرح نمازِ پنجگانہ کے اوقات کا بھی ذکر آتا ہے۔ لیکن دونوں کی تعیین اوقات عمومی انداز کی ہے اور ان کی ساعتوں اور گھڑیوں کے مطابق پکی تعیین علمائے کرام نے کی ہے۔ اور یہ تعیین علما دراصل اُن کے استنباط و خیال پر مبنی ہے۔ اور وہ بلاشبہ بڑی حد تک صحیح بھی ہے۔ لیکن بہرحال ہے وہ استنباط و نتیجہ ہی ہے۔

اسراء و معراج سے قبل سورۂ مومن وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ O (۱۱۰) کی بنیاد پر امام مزنی، یحییٰ بن سلام اور حضرت ابن عباسؓ سمیت ایک جماعتِ سلف نے مقرر کیا تھا کہ ایک نماز سورج کے غروب سے قبل تھی اور دوسری اس کے طلوع سے پہلے۔ (۱۱۱) بہرحال وہ خالص استنباط پر مبنی ہے اور اگر اس کی تائید و واقعاتی شہادت ملتی ہے تو رسولِ اکرم ﷺ کے اور آپ کے صحابۂ کرامؓ کے اقوال و اعمال سے۔

اسی طرح نمازِ پنج گانہ کے اوقات کی تعیین بھی بہت سے علمائے کرام نے قرآنی آیاتِ کریمہ کے حوالے سے کی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اُن میں سے ایک اہم ترین عالم ہیں جنہوں نے نمازِ پنج گانہ کے ارتقا پر بحث کی ہے اور اوقات کی تعیین بھی کی ہے۔ انہوں نے حسبِ ذیل آیاتِ کریمہ کے حوالے سے ان پنج گانہ اوقات کو متعین کیا ہے۔ سورۂ مزمل: ۱، مومن: ۶۰، احزاب: ۶، فتح: ۱، اعراف: ۲۴، انعام: ۶، نور: ۵، ۸، کہف: ۴، طور: ۲۰، بنی اسرائیل: ۹، دہر: ۳، طٰہٰ: ۸، ق: ۳۔ (۱۱۲)

متعدد دوسرے علما و اہلِ علم نے بھی یہی کیا ہے۔ یہ بہرحال ذاتی استنباطات یا عمومی بیانات پر تعیینِ اوقات کا معاملہ ہے اور پکا نہیں ہے۔ دوسرے ان آیاتِ کریمہ میں بعض مدنی سورتوں کی آیاتِ کریمہ بھی شامل کر لی گئی ہیں حالانکہ معاملہ و واقعہ مکی ہے اور ہماری بحث مکی آیاتِ کریمہ کا ہی بنیادی طور سے تقاضا کرتی ہے۔

احادیث و روایات کی بنا پر تعیین

قطعی اور حتمی تعیینِ اوقاتِ نماز کے لئے ہمیں احادیث و روایات پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے جو ثقہ و معتمد ہیں۔ بعض احادیث میں بھی بالخصوص صحیحین میں پانچوں نمازوں کے اوقات کے بارے میں عمومی

اندازِ تعین اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ موطا، بخاری ومسلم وغیرہ میں ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور اُنہوں نے نماز پڑھی اور رسولِ اکرم ﷺ نے نماز پڑھی، پھر نماز پڑھی رسول اللہ نے نماز پڑھی، پھر نماز پڑھی اور رسول اللہ ﷺ نے پھر نماز پڑھی، پھر جبرائیلؑ نے نماز پڑھی اور رسول اللہ نے نماز پڑھی، پھر انہوں نے نماز پڑھی، اور رسول اللہ نے نماز پڑھی اور جبرائیل ہی نے رسول اللہ ﷺ کے لئے نماز کے وقت کو مقرر کیا۔ (۱۱۳)

مؤخر الذکر کتبِ سیرت میں وضاحت ہے کہ پہلے دن ظہر کی نماز سورج کے زوال کے بعد، عصر کی نماز ایک مثل سایہ کے وقت، مغرب غروب کے معاً بعد، اور عشاء کی نماز شفق کے بعد پڑھی گئی اور فجر طلوعِ فجر کے ساتھ۔ دوسرے دن ظہر ایک مثل سایہ پر، عصر دو مثل سایہ پر، مغرب غروب کے معاً بعد اور عشاء ایک تہائی رات کے گزرنے پر اور نمازِ فجر خوب اسفار کے بعد سورج کے طلوع سے قبل، پھر حضرت جبریلؑ نے کہا: اے محمد ﷺ! نماز آج اور کل کی نمازوں کے درمیان پڑھنی ہے۔ الصلاۃ فیما بین صلوتک الیوم، وصلاتک بالامس امام ابن کثیر نے یہ صراحت کی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اسراء کی صبح نمازوں کے اوقات کی تعیین کی تھی اور یہ دو دنوں کی تعیین کا معاملہ ہے۔

بہرحال دوسری احادیث نبوی ﷺ اور روایاتِ سیرت سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ پانچوں نمازوں میں سے ہر ایک کا وقت پوری وضاحت کے ساتھ مقرر کیا گیا تھا۔ حافظ ابن حجر نے دوسرے امامانِ حدیث ابوداؤد، ابن خزیمہ، طبرانی وغیرہ کی بنیاد پر ہر ایک نماز کے اوقات کی تعیین کی ہے جو قطعی حتمی اور پکی ہے۔ یہ بحث خاصی طویل ہے لیکن اس کے بنیادی نکات یہ ہیں:

۱۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام صبحِ معراج کے ساتھ ہی نازل ہوئے اور دن و رات کی پانچوں نمازوں کو پڑھا اور پڑھایا اور اُس دن ان نمازوں کو اُن اوّلین اوقات میں پڑھا اور رسولِ اکرم ﷺ کو پڑھایا۔

۲۔ دوسرے دن پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام تشریف لائے اور اُس روز پانچوں نمازوں کو اُن کے آخری اوقات میں ادا کیا۔

۳۔ اور اُس دوسرے دن رسولِ اکرم ﷺ سے وضاحت کی کہ نمازوں کے اوقات ان دونوں سروں کے درمیان ہیں۔ (۱۱۴)

۴۔ تعیینِ اوقاتِ پنج گانہ میں یہ واضح ہوا کہ ہر نماز کے اولین اور آخری وقت کا دورانیہ خاصا

بڑا ہے اور کئی ساعتوں پر مشتمل ہے۔

۵۔ اوقاتِ نمازِ پنج گانہ کا خاصا طویل دورانیہ حکمتِ الٰہی پر مبنی ہے۔ جس میں انسانوں کی مصالح کی رعایت ہے۔

۶۔ ایک حکمتِ الٰہی یہ ہے کہ ایک نماز کا وقت ختم ہوا تو معاً بعد دوسری نماز کا وقت شروع ہوجائے۔ دو نمازوں کے اوقات میں وقفہ نہیں ہے سوائے نمازِ فجر اور نمازِ ظہر کے درمیان۔ ان دونوں میں لگ بھگ آدھے دن کا وقفہ دیا گیا ہے اور اس کی بھی ایک اور مصلحت وحکمتِ الٰہی ہے۔

۷۔ دو نمازوں کے درمیان لمبے دورانیے اور فجر اور ظہر کے اوقات میں طویل وقفے کی حکمت یہ ہے کہ بندوں کو دُنیاوی کام کاج کے لئے فارغ وقت ملے۔ گویا کہ اُن کی سہولت ونفع کو مدِ نظر رکھا گیا۔ اسی طرح ایک ہی نماز کے اولین وآخری وقت کے طویل دورانیے میں انسانی سہولت مقصود ہے کہ وہ بہ آسانی ان کے درمیان نماز ادا کرسکیں۔

۸۔ ظہر تا فجر (دوسری) مسلسل اوقاتِ نماز ہیں۔ مکروہ، افضل، مستحب وغیرہ سے بحث نہیں لیکن اوقاتِ عبادت کا یہ تسلسل بڑی مصالح رکھتا ہے۔

۹۔ دن اور رات کی نمازوں میں قرأتِ قرآنِ کریم میں فرق کیا گیا اور ظاہر ہے کہ یہ بھی تعلیمِ جبریلی میں شامل تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کی ایک حدیث ہے کہ جس نماز میں سری قرأت کا حکم دیا گیا اس میں ویسی کی اور جس میں بالجہر قرأت کا حکم دیا گیا اُس میں بہ آوازِ بلند کی:

قرأة النبی ﷺ فیما امر، وسکت فیما اُمر۔ (۱۱۵)

۱۰۔ دن کی دو نمازوں ظہر اور عصر میں قرأت وتلاوت سِرّی (بلا آواز) رکھی گئی۔ مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دن کے شور وشغب اور حرکت وہنگام میں قرأت کی سماعت مشکل ہوتی ہے لہٰذا بندوں پر استماع کا بارِ زائد نہیں ڈالا گیا۔ دوسری مصلحت وحکمت یہ تھی کہ کسی وقت مناجاتِ رب بلا آواز دل میں ہی صرف زبان کی حرکت کے ساتھ کی جائے، تاکہ قلب وذہن میں پوری حضوری کی کیفیت پیدا ہو۔ صحیح بخاری میں حضرت خباب بن ارت تمیمی، ایک مکی صحابیؓ کی روایت ہے کہ ہم مقتدی رسولِ اکرم ﷺ کی قرأت قرآن کو رسول اللہ ﷺ کی داڑھی کی لرزش سے پہچان لیتے تھے۔ (۱۱۶)

۱۱۔ رات کی نمازوں مغرب، عشاء اور فجر میں قرأتِ قرآنِ کریم بالجہر (آوازِ بلند کے ساتھ) مقرر کی گئی کہ حرکت سے سکون کے لمحات شروع ہوتے ہیں۔ آواز زیادہ سنی جاسکتی ہے۔ اس کا

پہنچنا اور سننا مقتدیوں کے لئے آسان ہے۔ اور قلب و ذہن کے ساتھ اعضاء و جوارح اور فضا و ماحول کو بھی قرآنِ مجید اور کلامِ الٰہی کی برکات سے روشناس کرانا تھا۔

۱۲۔ اسی اُصول پر رات کی نماز بالخصوص تہجد اور دوسری نمازیں، سنتیں، تراویح وغیرہ میں قرأتِ جہری بہتر ہے اور دن کی نمازوں، سنن و مستحبات میں بھی سری قرأت واجب کی ہے۔ (۱۱۷)

مکی نماز سے متعلق دوسرے احکام

کامل قنوت (توجہ)

مکہ مکرمہ کے ابتدائی دور میں تدریجی ارتقا کے قانون کے مطابق صحابۂ کرامؓ نماز کے دوران آپس میں سلام و دعا اور ضروری کلام بھی کر لیتے، چھینک آتی تو اس کے جواب میں الحمدللہ بھی کہہ لیتے، تھوڑی بہت حرکت اور چلت پھرت سے کام لیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ نماز کو کامل توجہ اور پوری یکسوئی کی عبادت بنانے کے اقدامات کئے جاتے رہے اور ایک عرصے کے بعد نماز پوری توجہ اور کامل قنوت کی عبادت بن گئی اور سلام کا جواب دینا اور ضروری کلام اور دُعا اور حرکت سب ممنوع ہوگئی۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے اہلِ علم نے سورۂ بقرہ۔۳۱: وقوموا الله قنتین کے نزول کے بعد نماز کو کامل توجہ و یکسوئی والی عبادت ہونا قرار دیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مدنی ارتقا ہے کیونکہ آیتِ کریمہ مدنی ہے۔ (۱۱۸) لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کی آیاتِ کریمہ، اُن کی تفاسیر اور احادیثِ نبویؐ سے ثابت ہوتا ہے کہ نمازِ کامل بننے کا ارتقائی عمل مکی ہے اور وہ وسطِ مکی عہد میں پورا ہو چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ مہاجرینِ حبشہ میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی واپسی کے بعد ہی تمام ہو گیا تھا۔ حضرت زید بن ارقم انصاری خزرجیؓ کی ایک روایت اور بعض دوسری احادیث سے بحث کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے تمام روایات کا تجزیہ کیا ہے۔ اُن میں سے امام ابن حبان کا ایک واضح بیان ہے کہ کلام کی ممانعت اور منسوخی مکہ مکرمہ میں ہجرتِ نبویؐ سے تین سال قبل ہو چکی تھی کان نسخ الكلام بمكة قبل الهجرة بثلاث سنين حضرت زید بن ارقمؓ کی حدیث کی توجیہ میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد اُن کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ مکی مسلمانوں کا نبی اکرم ﷺ کے پیچھے کلام کرنا مراد ہے۔ ایسی تمام روایات و احادیث کی تاویل کر کے امام ابن کثیرؒ نے بھی یہی ثابت کیا ہے کہ ہجرت حبشہ کے بعد کامل قنوت کا حکم ہو گیا تھا۔ (۱۱۹)

سورۂ فاتحہ اور دیگر سورہ کی قرأت

سورۂ فاتحہ کی قرأت کے ساتھ ایک دوسری سورت یا اُس کی آیاتِ کریمہ، کم از کم تین چھوٹی یا ایک بڑی آیت کی قرأت نماز کی صحت کے لئے ضروری ہے اور رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ سے ثابت ہے۔ قطع نظر مسلکی اختلاف کے کہ محض قرآنِ مجید کی قرأت فرض ہے یا سورۂ فاتحہ کی، اور علما وفقہا کے آرائے مختلفہ کے یہ حقیقت اپنی جگہ باقی اور مسلم ہے کہ رسولِ اکرمؐ سورۂ فاتحہ کے نزول کے بعد ہی سے اس کو اور ایک دوسری سورۃ کو پڑھنے پر عامل تھے۔ قرأتِ فاتحہ کے ضمن میں بالعموم علما وفقہا اور شارحین حدیث نے اس کے شرط یا وجوب سے تو بحث کی ہے مگر وقتِ قرأت سے ذرا کم تعرض کیا ہے۔ (۱۲۰)

نزول فاتحہ مکی ہے اور وہ بھی بالکل ابتدائی دور میں۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے کہ ''یہ نبوتِ محمدی کے بالکل ابتدائی زمانے کی سورت ہے بلکہ معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی مکمل سورت جو محمد ﷺ پر نازل ہوئی وہ یہی ہے۔ اس سے پہلے صرف متفرق آیات نازل ہوئی تھیں جو سورۂ علق، سورۂ مزمل اور سورۂ مدثر وغیرہ میں شامل ہیں۔'' (۱۲۱)

امام ابن کثیرؒ وغیرہ کی بحث سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ فقیہانہ موشگافی سے قطعِ نظر سنتِ ثابتہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ اپنی نمازوں کا سورۂ فاتحہ سے آغاز کرتے تھے اور پھر دوسری سورۃ یا اس کی آیات ملاتے تھے اور سورۂ فاتحہ کے نزول کے بعد سے یہ طریقہ مقرر ہو گیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ دوسری سورہ ملانے کا عمل مکی ہے اور وہ بھی ابتدائی دور کا۔ بخاری، مسلم اور دوسری کتب حدیث کی بہت سی روایات سے بھی واضح ہوتا ہے کہ مدینہ منورہ میں جب تین نمازوں میں چار چار رکعات کر دی گئیں تو پہلی دو رکعتوں کا مکی طریقہ برقرار رہا اور بعد کی اضافہ شدہ رکعات میں صرف سورہ فاتحہ پڑھی جانے کی سنتِ نبوی ثابت رہی۔ اور ان میں دوسری سورت ملانے کا حکم ہوا نہ عمل۔ یہ دلیل بھی ثابت کرتی ہے کہ سورۃ ملانے کا عمل مکی ہے۔ (۱۲۲)

آمین کا مسئلہ

نماز میں یا نماز کے باہر سورۂ فاتحہ کی تلاوت وقرأت کے بعد آمین کہنا مسنون ہے۔ اگرچہ وہ قرآن کا حصہ نہیں بلکہ حدیث شریف سے اس کے کہنے کا ثبوت ملتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آمین کہنے کی مسنونیت کب ہوئی؟ قیاس ومنطق اور سنتِ نبوی ﷺ کی فطرت سب کا تقاضا ہے کہ سورۂ فاتحہ کے

نزول کے بعد ہی آمین کہنا مسنون قرار پایا تھا۔ اس کی روایت وحدیث سے پوری طرح تائید بھی ہوتی ہے اور اس کا سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ وحیٔ حدیث نے اس کا استحباب یا مسنون ہونا طے کیا تھا۔ یعنی رسولِ اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی براہِ راست ہدایت کے مطابق آمین کہنا مسنون قرار دیا تھا۔

احکام قرآن وحدیث پر کام کرنے والے محققین، فقہا نے اس مسئلے پر کافی طویل طویل فصلیں باندھی ہیں۔ امام قرطبیؒ کا درجہ اُن میں کافی بلند ہے۔ اُنہوں نے اپنی کتاب میں سورۂ فاتحہ کے تیسرے باب میں آمین کہنے کے آٹھ مسائل سے بحث کی ہے۔ اُن میں سب سے یہاں بحث نہیں کرنی صرف آمین کے آغاز اور اس کی وحی حدیث اور مکی سنت سے تعرض کرنا ہے۔ آمین کو صحیفے پر مہر لگا کر ختم کرنے کے مانند قرار دیتے ہوئے رسولِ اکرم ﷺ کی ایک حدیث یہ بیان کی ہے کہ ''مجھے جبرائیل علیہ السلام نے فاتحۃ الکتاب سے فراغت کے بعد آمین کہنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ وہ کتاب پر مہر لگانے کے مانند ہے''۔ محقق وحاشیہ نگار گرامی عبدالرزاق المہدی نے لکھا ہے کہ اسے ''غریب'' قرار دیتے ہوئے حافظ ابن حجر کا ایک تبصرہ تخریج الکشاف (۱۲۳) سے نقل کیا ہے کہ میں نے اس طرح اس حدیث کو نہیں پایا، البتہ ابن ابی شیبہ کی کتاب الدُعاء میں ایک عظیم وجلیل تابعی حضرت ابومیسرہؒ سے یہ مروی ہے کہ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے نبی ﷺ کو فاتحۃ الکتاب پڑھائی اور جب ولا الضالین پر پہنچے تو آمین کہنے کی ہدایت کی: اقرأ جبريل النبی ﷺ فاتحة الكتاب، فلما وصل "ولا الضالين" قال له، قل آمين اس کے علاوہ بھی بعض روایات ہیں۔ (۱۲۴)

نماز میں سورتوں کی قرأت

ظاہر ہے کہ یگانہ، دوگانہ یا پنج گانہ نمازوں میں اول روز نماز سے اس کے تمام ارتقائی مراحل کے دوران قرآن کی تلاوت کی جاتی تھی۔ نماز میں سورۂ فاتحہ کے علاوہ ایک اور سورت بھی پڑھی جاتی تھی۔ ایک قول کے مطابق سورۂ فاتحہ اولین روز سے نماز کی قرأت رہی تھی۔ دوسری سورت کا اضافہ اسی کے ساتھ ہوا ہو یا کچھ بعد میں وہ بہرحال کامل قرأتِ نماز کا حصہ بنا اور مکی دورِ نبویؐ میں ہی بنا تھا۔ لہٰذا نمازوں میں خواہ وہ فرض رہی ہوں یا نفل، جیسے نمازِ تہجد یا صلوٰۃ اللیل، نماز میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ دیگر کی قرأت کا معمول تھا۔ اوقاتِ نماز کی تعلیم جبرائیلی اور امامت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ نماز میں قرآنِ کریم کے ان حصوں کا پڑھنا بھی اولین دن سے ہوا تھا۔ یعنی سورۂ فاتحہ کے نزول کے معاً بعد سے۔

یہاں ایک اُصولی بحث سے زیادہ غرض ہے۔ وہ یہ کہ رسولِ اکرم ﷺ اور آپؐ کے مکی صحابہؓ تو مکہ میں نمازیں ادا کرتے تھے۔ وہ اپنی نمازوں میں سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت یا قرآنِ کریم کی چند آیات کی قرأت کیا کرتے تھے کہ اُن کے سامنے سنت نبوی ﷺ موجود تھی، دوسرے مقاماتِ اسلام جیسے یثرب، بحرین، مقاماتِ جہینہ مزینہ، غفار واسلم اور دیگر مقامات کے مسلمان کیا معمول رکھتے تھے؟ اس کا ظاہر جواب یہ ہے کہ وہ بھی رسولِ اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق اور آپ کی تعلیم واجازت سے وہی کرتے تھے۔ کیونکہ ان کو تعلیمِ نماز کے ساتھ ساتھ قرأتِ قرآن اور دوسری ضروری اور مسنون چیزوں کی بھی عملی اور نظری تعلیم دی جاتی تھی۔ تعبدی معاملات میں صحابۂ کرامؓ اپنی رائے یا اپنے اختیار سے کوئی عمل نہیں کرتے تھے۔ وہ بہرحال رسولِ اکرم کے حکم اور ارشاد کے پابند ہوتے تھے۔ اس اُصول کا ذکر نمازِ جمعہ کی فرضیت کے ضمن میں کتبِ حدیث وسیرت میں ملتا ہے۔

مدینہ منورہ کے حوالے سے ایک اور اُصولی بحث اور حکم کا سراغ ملتا ہے اور وہ بھی نماز میں قرأتِ قرآن سے ہی متعلق ہے۔ امام بخاریؒ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرتِ نبویؐ سے قبل مسجدِ قباء میں ایک انصاری امام پہلے سورۂ فاتحہ کے بعد سورۂ اخلاص پڑھتے اور اس کے بعد ایک اور سورت پڑھتے تھے۔ وہ ہر رکعت میں سورۂ اخلاص ضرور پڑھتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اس باب کا عنوان ہی ایک رکعت میں دو سورتیں جمع کرنے کا رکھا ہے۔ (۱۲۵) حدیث کا بیان کافی طویل ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مقتدیوں نے جب یہ کہا کہ صرف ایک سورہ پر ہی اکتفا کریں تو اُنہوں نے فرمایا کہ میں تو سورۂ اخلاص ترک نہیں کرسکتا۔ آپ لوگ پسند کریں تو اسی طرح امامت کرتا رہوں ورنہ کوئی دوسرا امام مقرر کرلیں۔ مقتدیوں نے اُن کی بات مان لی۔ ہجرتِ مدینہ کے بعد جب رسولِ اکرم ﷺ قباء تشریف لائے تو معاملہ آپ کے روبرو پیش ہوا، آپ نے امام سے سبب پوچھا تو انہوں نے عرض کی کہ ہر رکعت میں سورۂ اخلاص پڑھنا انہیں اس لئے پسند ہے کہ وہ سورت انہیں محبوب ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا، اس سے تمہاری محبت تم کو جنت میں لے جائے گی۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اور اُن سے پہلے امام بخاریؒ نے ایک رکعت میں دو سورتوں کے پڑھنے کی بات کہی ہے اور متعدد روایات نقل کی ہیں کہ رسولِ اکرم ﷺ اور صحابۂ کرامؓ ایک دو ہی نہیں پوری مفصل۔ بیس سورتیں۔ ایک رکعت میں پڑھتے تھے۔ (۱۲۶) حافظِ موصوف نے امامِ مسجد قبا کا نام حضرت کلثوم بن ہدم بخاری خزرجیؓ بتایا ہے۔ لیکن یہ تفصیلات تو اپنی جگہ، اصول اور اصولی حکم یہ ہے کہ رسولِ اکرم کی

پیشگی اجازت وامر کے بغیر وہ دوسورتوں کو ملاتے تھے اور دوسرا اُصولی حکم کہ رسولِ اکرم ﷺ نے نہ صرف اس کی تصویب کی بلکہ اس کی تحسین کر کے مہرِ تصدیق ثبت فرمادی۔ اس روایت سے تعبدی معاملات میں ارشاد وحکمِ نبوی کی شرط کی نفی نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہ تعبدی معاملہ سنت ونفل سے زیادہ متعلق تھا، فرض یا وجوب سے نہیں۔ سورۂ اخلاص کا ہر رکعت میں لازمی اضافہ دراصل مستحب معاملات کے ضمن میں آتا ہے۔

اس سے ایک اور اُصول اور ایک اور حکم مستنبط کیا جاسکتا ہے اور وہ بالکل قرآن وحدیث کے مطابق ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ سے مسنون معاملات میں اور بعض دوسرے اچھے کاموں میں اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ اور اس سے زیادہ اہم یہ اصول وحکم کہ رسولِ اکرم ﷺ ہر اچھے کام کی تصویب و تحسین وتصدیق فرمادیتے تھے خواہ وہ آپ کی پیشگی اجازت کے بغیر ہی کیوں نہ انجام دیا گیا ہو، جیسا کہ اس واقعے کے علاوہ دوسرے واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ اصل حکم اور اصل الاصول یہ ہے کہ خیر کی بات ہمیشہ سنت بن جاتی ہے اور اسلامی کہی جاسکتی ہے جبکہ فرض ووجوب کے معاملات میں صحابۂ کرامؓ اپنی رائے اور اپنے اختیار سے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

تشہد ودرود ودعا کی تعیین

احادیثِ نبوی اور دوسری روایات سے واضح ہوتا ہے کہ نماز کے آخری جلسے میں التحیات، درود وصلوٰۃ اور دعا بھی مکی دور میں متعین ہو چکے تھے۔ اس کی ایک درایتی دلیل یہ ہے کہ ان سے متعلق تمام روایات واحادیث ابتدائی مکی صحابۂ کرامؓ سے مروی ہیں اور بعض تو بہت ہی عظیم اکابر سے۔ بالعموم روایات بیان کرنے کے بعد علمائے کرام اُن کی توقیت اور زمانی تعیین کے بارے میں صراحت سے کام نہیں لیتے، اس لئے غلط فہمی یا کج فہمی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ نماز سے متعلق تمام بنیادی مسائل کی تعلیم رسولِ اکرم ﷺ نے صحابۂ کرامؓ کو مکہ میں ہی دی تھی۔ بعض جزئیات بعد کی ہوسکتی ہیں لیکن تمام مہمات مسائل کی تعلیم مکی ہے اور نماز کی بنیادی صورت گری مکہ مکرمہ میں پوری طرح سے ہوچکی تھی۔

تشہد

حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم جبرائیل ومیکائیل علیہما السلام اور فلاں فلاں پر سلام بھیجا کرتے تھے۔ رسولِ اکرم نے ایک دن ہماری طرف توجہ کی اور التحیات سکھائی:

کنا اذا صلینا خلف النبی قلنا السلام علیٰ جبریل و میکائیل،

السلام علیٰ فلان وفلان، فالتفت الینا رسول اللّٰہ ﷺ فقال: ان اللہ ھو السلام، فاذا صلیٰ احدکم فلیقل: التحیات للّٰہ والصلوات والطیبات، الخ۔ (۱۲۷)

یہ حدیث مکی ہے اور حضرت ابن مسعودؓ کا ہی عمل نہیں بلکہ تمام مکی صحابۂ کرامؓ کا عمل ہے۔ پھر اس حدیث کو مدنی دور سے وابستہ کرنے کا کوئی قرینہ نہیں ہے جبکہ مکی تعامل سے وابستگی کے قرینے ہی نہیں شواہد و دلائل بھی ہیں۔

درود برنبی ﷺ

اسی طرح رسولِ اکرم ﷺ نے بطورِ خاص نماز کے لئے صلوٰۃ النبیؐ سکھائی۔ وہ بھی بنیادی طور سے مکی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس نکتے پر امام بخاریؒ کے باب کے سبب پر بحث کی ہے کہ تشہد کے بعد کی دعا اور درود میں نمازی کو اختیار ہے کہ وہ جو چاہے پڑھے۔ فقیہانہ بحث کے علاوہ اصل نکتہ یہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے صلوٰۃ النبی کی دعائے خاص سکھائی تھی اور سلام سے پہلے کی بھی۔ دونوں مسنون ہیں یا واجب، بہرحال وہ سنتِ نبوی ﷺ ہیں اور مکی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ (۱۲۸)

درود وصلوٰۃ کی مدنی احادیث و روایات سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ درود کی فرضیت یا مسنونیت مدنی دور میں ہوئی تھی۔ اس کا واحد مطلب یہ ہے کہ بعض صحابۂ کرامؓ رسولِ اکرمؐ کی تعلیم کردہ درود سیکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ ورنہ درود وصلوٰۃ مکی دور کی سنت ہے۔

سلام سے قبل دعا

امام بخاریؒ نے اس کا عنوان ''باب الدعا قبل السلام'' باندھا ہے اور اس میں دو روایات نقل کی ہیں۔ اور آخری حضرت ابوبکر صدیقؓ سے مروی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے اُن کی درخواست پر اُن کو سلام سے قبل کی دُعا سکھائی تھی جو معیار بن گئی:

عن ابی بکر الصدیقؓ انہ قال لرسول اللّٰہ ﷺ: علمنی دعاء ادعوبہ فی صلاتی، قال، قل اللھم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً۔ (۱۲۹)

ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیرہ سال کے بعد مدینہ منورہ میں یہ

درخواست نہیں کی تھی بلکہ شروع مکی دور میں کی تھی لہٰذا وہ مکی سنت ہے۔

ان تمام روایات و احادیث اور مباحثِ فقہاء و محدثین سے ثابت ہوتا ہے کہ تشہد کی تمام دعائیں مکی دور میں تعلیم کی جا چکی تھیں۔ اگرچہ تکبیر تحریمہ قرأتِ فاتحہ سے قبل سبحانک اللھم کی قرأت، رکوع و سجود اور قومہ کی تسبیحات اور ہر اُٹھنے اور جھکنے پر تکبیر اور نماز ختم کرنے کی علامتِ تسلیم کے بارے میں روایات سے بحث نہیں کی گئی، لیکن ان کے بارے میں بھی یہ حتمی ہے کہ وہ سب کی سب مکی تعلیماتِ نماز تھیں۔ مدنی روایات ان کو مدنی نہیں بناتیں، صرف ان کی بعد کی ترسیل و روایت کا فائدہ دیتی ہیں جیسے وضو کی آیتِ کریمہ وغیرہ۔

امامت واقتدا کے مسائل

مکی نماز کے ارتقا سے متعلق ایک اور اہم اُصول یا مسئلہ امامتِ نماز اور اقتدا کا بھی ہے۔ کتبِ حدیث و سیرت کی بہت سی گزشتہ روایات و احادیث میں ذکر آ چکا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ کو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے اپنی امامت میں پہلے دو رکعت نماز پڑھائی تھی اور پھر اسراء و معراج کے بعد نمازِ پنج گانہ میں بھی اسی طرح امامت کی اور رسولِ اکرم ﷺ نے اُن کی اقتدا کی۔ بعض علما و فقہا نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کی امامت اور آپ کی اقتدا پر علمی موشگافی کی ہے۔ جس سے ہمیں اس وقت بحث نہیں ہے۔ اگر امامتِ جبرائیلی کو بعض اصحابِ فکر کے مطابق تاویل کی خراد پر بھی چڑھا دیا جائے تب بھی یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ اوّل روز سے ہی نماز میں امامت اور اقتدا کا مسئلہ بلکہ مسائل قائم ہو چکے تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے حضرت خدیجہؓ کی تو بہر حال امامت کی تھی اور پھر نبویؐ امامت میں صحابۂ کرامؓ نمازیں پڑھتے رہے تھے اور آپ کی عدم موجودگی میں صحابہؓ میں سے ہی کوئی امامت کرتا تھا اور بقیہ نمازی اقتدا کرتے تھے۔ امامت واقتدا کے بعض مسائل تھے جن کو نکات کی شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

۱۔ نمازِ فرض باجماعت ادا کی جاتی تھی جس میں ایک امام ہوتا تھا اور دوسرے نمازی مقتدی۔

۲۔ امامِ نماز کی اقتدا مقتدیوں پر فرض تھی اور وہ اس کی متابعت کرتے تھے۔

۳۔ امامِ نماز جماعت میں تن تنہا آگے کھڑا ہوتا تھا اور مقتدی اُس کے پیچھے صفیں بناتے تھے۔ شروع میں عورتیں ساتھ ہی کھڑی ہوتی تھیں، جیسا کہ حضرت خدیجہؓ کے واقعے سے معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ قرأتِ قرآن کے سلسلے میں وہ بعض روایات کے مطابق سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے اور دیگر سورہ

نہیں پڑھتے تھے اور دوسری روایات کے مطابق رسولِ اکرم اکے خلجان کے واقعے کے بعد کامل سکوت کے ساتھ استماعِ قرآن کرتے تھے۔

۵۔ رکوع و سجود اور دوسری تسبیحات وہ آہستگی سے ادا کرتے تھے۔ اسی طرح تشہد کے تمام معمولات بھی سرّی تھے۔

۶۔ مکی مقتدی صحابۂ کرامؓ امامِ نماز کے بعد ہی رکوع و سجود کرتے تھے اور دوسری حرکات میں متابعت کرتے تھے۔

۷۔ امامت اور اقتدا کا معاملہ صرف فرض نمازوں کے ساتھ خاص تھا۔ مسنون یا گھریلو نمازیں اس میں شامل نہیں تھیں۔

۸۔ لیکن صلوٰۃ اللیل (نمازِ تہجد) کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ مکی صحابۂ کرامؓ اس میں نبوی امامت کی اقتدا کرتے تھے۔

۹۔ فرض نمازوں میں جماعت کی تاکید اور مسنون نمازوں میں جماعت کا استحباب معلوم ہوتا ہے کیونکہ بہت سے صحابۂ کرامؓ تنہا نمازیں بھی پڑھا کرتے تھے۔

۱۰۔ اسی طرح بعض دوسرے معاملات و مسائلِ جماعت تھے جو مکی دور کے تھے۔ ان میں سے بعض کا ارتقا بعد کا بھی ہوسکتا ہے۔

نمازِ جمعہ

پہلے نمازِ یگانہ یا دوگانہ اور پھر نمازِ پنج گانہ کے ارتقا اور تعامل کے ساتھ اجتماعی نماز کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جو وحدتِ اُمت کا ایک مظہر بھی تھا۔ اتحادِ ملت کی ایسی مذہبی، سماجی اور تہذیبی روایات ہر قوم، ملت اور مذہب میں پائی جاتی ہیں اور وہ جاہل حنفی عربوں میں بھی موجود تھیں۔ ان میں سالانہ حج اور سالانہ عید کا حوالہ بہت ملتا ہے۔ حج کے سالانہ تہوار اور اجتماعی عبادت پر بحث اس کے متعلقہ باب میں آتی ہے۔ عربوں بالخصوص قریش کی سالانہ عید (یوم العید) کا ذکر و حوالہ چارا کا براحناف کے ضمن میں روایاتِ سیرت و تاریخ میں ملتا ہے۔ لیکن سالانہ اجتماعی تہواروں اور عبادتوں سے زیادہ، ایک زیادہ ضروری اور ملی نفسیات کے تقاضوں کو پورا کرنے والی عبادت کی ضرورت تھی۔ (۱۳۰)

یہ ہفتے واری اجتماعی عبادت کی روایت و رواج سے پوری ہوسکتی تھی اور وہ پوری طرح فطری

اور قدرتی بھی تھی۔ قدرتی یوں کہ تقسیم وقت میں دن و رات کے مقابلے میں ہفتے وار تقسیم بہت مناسب تھی کہ نہ بہت جلدی کی تھی اور نہ طویل مدت کی تھی۔ ماہانہ اور سالانہ دونوں تقسیمیں خاصی طویل مدت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اور ان سے نفسیاتی اور فطری تقاضے کی تسکین ذرا مشکل تھی۔ فطری یوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ماہ کو سات دنوں کے ہفتے میں تقسیم کر کے ایک عمدہ، اطمینان بخش اور معتدل و مناسب مدت خود مقرر کر دی تھی۔ ہفتے کی اس فطری، قدرتی اور الٰہی تعیین نے ہفتے واری اجتماعی عبادت کی ضرورت اور مناسبت کے خیال کو جنم دیا تھا اور عملی روپ بھی بخشا تھا۔ (۱۳۱)

اسلامی دین و شریعت کے سابقہ مظاہر میں بھی اسی بنا پر ہفتے واری عبادتِ اجتماعی کا سلسلہ چلا تھا۔ وہ روایاتِ حدیث و سیرت اور واقعاتِ تاریخ و مذہب سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ الٰہی تعیین کے مطابق جمعے کا دن اس لئے منتخب کیا گیا تھا کہ تمام سابقہ ادیان اور مذاہب اور تمام اسلامی شرائع میں جمعے کو ہی ہفتے واری اجتماعی عبادت کے لئے مقرر و متعین کیا گیا تھا۔ لیکن بعض اقوام اور ملتوں نے اپنے تحریفی ادوار اور گمراہی کے جذبات میں اللہ کے مقرر کردہ دن جمعہ کو اپنی پسند سے بدل ڈالا۔ یہود نے سنیچر (سبت) کو مقرر کر لیا تو نصاریٰ نے اتوار (احد) کو اجتماعی عبادت کا دن بنا دیا اور دوسروں نے اور دن چن لئے۔ (۱۳۲)

اللہ تعالیٰ نے اپنے ازلی و ابدی اور آفاقی دین و شریعتِ محمدی میں اپنے مقرر کردہ ہفتے واری یومِ جماعت کا احیاء کیا۔ جمعے کی ہفتے واری عبادت کی تعیین نہ صرف دینِ ابراہیمی کے ایک حکم، ایک عمل اور ایک روایت کا احیاء ہے بلکہ اصل کا دوامی استمرار بھی ہے۔ جمعے کی فضیلت اور تقدس مآبی پر روایاتِ حدیث و سیرت و تاریخ کے علاوہ خود قرآنِ مجید بھی کافی شہادت پیش کرتا ہے۔ تمام روایات کے تجزیے سے ثابت ہوتا ہے کہ جمعے کی عبادت یا نماز یہود و نصاریٰ کی تحریفات سے قبل ایک اسلامی روایت رہی تھی۔ تاریخی لحاظ سے جمعے کو روزِ آفرینش بھی کہا جا سکتا ہے اور تمام اقوام و ملل میں اسی بنا پر وہ ہفتے واری یومِ اجتماع و عبادت بنایا گیا تھا۔ (۱۳۳)

غلط فہمی یا بے بصیرتی سے یا ناقص مطالعے و تجزیے کے سبب نمازِ جمعہ کی مشروعیت کو مدنی دور کا واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کی ابتدا، مشروعیت اور عمل مکی دور کے آخری زمانے کا ایک تاریخی واقعہ، اسلامی سنگِ میل اور اجتماعی عبادت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس نمازِ جمعہ کی اقامت و اجرا کا شرف مکہ مکرمہ کے سوا کسی دوسرے شہرِ عرب اور مقامِ مسلم کو ملا تھا۔ مدینہ میں نمازِ جمعہ کی اوّلین اقامت اور ابتدا کا ایک روحانی اور باطنی پہلو یہ بھی ہے کہ اسے جلد ہی مرکزِ اسلام و شہرِ رسولؐ بننا تھا۔

ظاہری سبب یہ تھا کہ مکہ مکرمہ میں کافر ومشرک اکثریت اور اُن کے سماجی، سیاسی اور دینی غلبے کے سبب اس اجتماعیت کا رُوبہ عمل آنا ممکن نہ تھا۔ (۱۳۴)

روایاتِ سیرت وحدیث سے واضح ہوتا ہے کہ یثرب/ مدینہ میں سب سے پہلے نمازِ جمعہ اپنے لوازم کے ساتھ پڑھی گئی۔ یہ تنظیم الٰہی اور تقدیر ربانی تھی کہ اوّلین نمازِ جمعہ کا آغاز اُسی اوّلین مسجد میں ہو، جسے کچھ مدت بعد مسجدِ نبوی ﷺ کا شرف ملنا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیثِ بخاری سے واضح ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ انصار نے مسجدِ نبوی ﷺ کے مقام پر سب سے پہلی نمازِ جمعہ ادا کی۔ اُن کو نمازِ جمعہ پڑھانے والے، مسلم اجتماعیت پیدا کرنے والے اور یہود ونصاریٰ کے بالمقابل ہفتے واری اجتماعی عبادت قائم کرنے والے حضرت اسعد بن زرارہؓ تھے۔ وہ نہ صرف مدنی مسلمانوں کے عظیم ترین سردار تھے بلکہ رسولِ اکرم ﷺ کے مقرر کردہ نقیبوں کے امام بھی تھے اور اس لحاظ سے جانشینِ نبوی بھی تھے۔ (۱۳۵)

امامِ سیرت ابن اسحاق کا بیان ہے کہ حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ نجاری خزرجیؓ نے اول اول نمازِ جمعہ قائم کی۔ حضرت کعب بن مالک نجاری خزرجیؓ کی عینی شہادت کے مطابق انہوں نے یثرب/ مدینہ کے چالیس مسلمانوں کے ساتھ نمازِ جمعہ پڑھائی۔ مقامِ نماز بنو بیاضہ کے حرہ میں، واقع ''ھزم النبیت'' نامی مقام تھا جس کو ''نقیع الخضمات'' بھی کہا جاتا تھا:

کان اول من جمع بنا بالمدینة فی ھزم النبیت، من حرة بنی بیاضة، یقال له نقیع الخضمات، قال قلت و کم انتم یومئذ؟ قال اربعون رجلا (۱۳۶)

سہیلی نے جمعہ اور ہفتے واری اجتماعی عبادت سے متعلق تمام روایات واحادیث سے بحث کی ہے۔ اُن کی بحث کافی طویل اور مفصل ہے۔ اس کے اہم ترین نکات یہ ہیں۔ جمعے کا نام وتسمیہ توفیقِ الٰہی سے صحابۂ کرامؓ نے رکھا تھا، جاہلی عرب اس دن کا نام العروبۃ رکھتے تھے۔ نمازِ جمعہ کا قیام حکمِ الٰہی آنے سے قبل خالص توفیقِ الٰہی پر مبنی تھا۔ نمازِ جمعہ سے متعلق سورۂ جمعہ ہجرتِ نبویؐ کے بعد مدینے میں نازل ہوئی اور اس کا فرض اور حکم مستقل بھی ہوگیا اور استمراری بھی۔ اسی بنا پر رسولِ اکرم ﷺ نے جمعے کے دن کے بارے میں فرمایا تھا کہ اس دن کو یہود ونصاریٰ نے کھو دیا لیکن اللہ نے اس کی توفیق تم کو بخش دی۔

بعض دوسری روایات کے مطابق اہلِ مدینہ نے جمعے کی نماز رسولِ اکرم ﷺ کی مدینہ

تشریف آوری سے قبل مگر آپ کے حکم سے ہی قائم کی۔ انصار نے یہود و نصاریٰ کو دیکھا کہ وہ بالترتیب سنیچر اور اتوار کو ہفتے واری عبادت انجام دیتے ہیں لیکن اُنہوں نے جمعے کا دن مقرر کرلیا۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ نے ان کو اُس دن دو رکعتیں پڑھائیں اور ان نمازیوں کے لئے ایک بکری ذبح کر کے اُن کے ظہرانے اور عشائیے کا اہتمام بھی کیا۔ اور اس کے بعد سورۂ جمعہ کی آیاتِ کریمہ نازل ہوئیں۔ بلاشبہ انصار نے توفیقِ الٰہی سے نمازِ جمعہ کا انتظام کیا تھا، تاہم یہ بعید ہے کہ اُن کا فعل رسولِ اکرم ﷺ کی اذن و اجازت کے بغیر رہا ہو کیونکہ معاملاتِ عبادت کی تعیین صرف شارع کرسکتا ہے۔ امام دارقطنی کی ایک حدیث میں صراحت ملتی ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے اپنی ہجرت سے قبل ان کو نمازِ جمعہ قائم کرنے کی اجازت مرحمت فرمادی تھی اور مکہ مکرمہ میں اس کی اقامت بوجوہ نہیں فرما سکے تھے۔ دوسری روایت کے مطابق رسولِ اکرم ﷺ نے ایک نامۂ مبارک بھیجا تھا، جو حضرت مصعب بن عمیر بدریؓ کے نام تھا۔ اُس میں ہدایت دی گئی تھی کہ وہ مسلمان عورتوں اور بچوں کو جمعے کے دن جمع کریں۔ نماز کا وقت زوال کے بعد مقرر فرمایا تھا اور دو رکعات ادا کرنے کی ہدایت دی تھی۔ اس روایت کے مطابق حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ اولین نمازِ جمعہ قائم کرنے والے بزرگ تھے۔ رسولِ اکرم ﷺ جب مدینے تشریف لائے تو ظہر کے وقت نمازِ جمعہ ادا فرمائی۔ آپ ﷺ کی اولین نمازِ جمعہ اور اولین خطبۂ جمعہ مسجد بنی سالم بن عوف میں ہوا تھا جیسا کہ تمام کتبِ حدیث و سیرت میں بیان ہوا ہے اور مدینہ خاص کا جمعہ دوسرا تھا۔ (۱۳۷)

امام سہیلی کی روایات میں تطبیق کی صورت یہ ہے کہ نامۂ نبوی تو حضرت مصعب بن عمیر عبدریؓ کے نام تھا مگر اُنہوں نے امامت کا منصب حضرت اسعد بن زرارہ نجاریؓ کو سونپ دیا تھا جو نقیب النقباء کی حیثیت سے امامِ مسلمین تھے۔ دوسری وجہِ تطبیق یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ایک جماعت کو حضرت مصعبؓ نے اور دوسری جماعت کو حضرت اسعد بن زرارہؓ نے نمازِ جمعہ پڑھائی تھی۔ دوسری تطبیقی صورت کی تائید بالواسطہ ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن کے مطابق ایک علاقے کے امام حضرت مصعب عبدریؓ تھے اور انصار کے دوسرے علاقے اور نمازیوں کے دوسرے امام حضرت اسعد بن زرارہؓ تھے اور دونوں نے بیک وقت مگر الگ الگ نمازِ جمعہ قائم کی تھی۔

بہرحال اختلافِ روایات باقی رہے یا اُن میں تطبیق ہوجائے، ہمارے نقطۂ نظر اور نقطۂ بحث پر ذرا اثر نہیں پڑتا۔ ہماری اصولی اور بنیادی بحث یہ ہے کہ مکی دور میں نمازِ جمعہ کی مشروعیت ہوئی تھی اور وہ حقیقی طور سے یثرب میں ہجرت سے قبل پڑھی گئی تھی۔ اس میں دو رکعات ہی ادا کی گئی تھیں۔ نماز

باجماعت ہوئی تھی اور اجتماعی طور سے مسجدِ یثرب میں ادا اور قائم کی گئی تھی۔ ان روایات میں خطبہ واذان وغیرہ کا ذکر نہیں پایا جاتا اور یہ صحیح ہے کہ اذان نہیں دی گئی تھی کہ وہ خالص مدنی حکم اور عمل ہے۔ خطبے کا امکان ہے مگر وہ بھی نمازِ جمعہ کا لازمی حصہ نہیں ہے۔ واجب کہنے والوں کے نزدیک بھی نماز ادا کرنے سے جمعے کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔ مگر بعض روایات واحادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے نمازِ جمعہ ادا کرنے سے قبل خطبہ دینے کا حکم بھی دیا تھا۔

اسی طرح علمائے کرام میں اس نمازِ جمعہ کی فرضیت پر اختلاف ہے۔ بقولِ حافظ ابن حجرؒ اکثر کا خیال ہے کہ اس کی فرضیت مدینے میں ہوئی اور شیخ ابوحامدؒ کے بقول مکہ میں فرضیت آئی۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کو غریب قرار دیا ہے۔ اور امام ابن المنیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آیتِ کریمہ **اذا نودی للصلوۃ من یوم الجمعۃ الخ** کی وجہ الدلالت اذان کی مشروعیت ہے اس طرح اذان خواص فرائض میں ہو جاتی ہے اور اسی کے سبب خرید وفروخت بھی ممنوع ہو جاتی ہے۔ مزید فقہی بحث بھی ملتی ہے۔ لیکن سوال صرف یہ ہے کہ اذان فرض نہیں، جمعے کی نماز کے قیام کے لئے بھی فرض نہیں۔ اور سب سے اہم بات مکی دور میں یثرب اور جواثی دونوں مقاماتِ اسلام پر اجازتِ نبویؐ سے نمازِ جمعہ ادا کی جاتی رہی اور بلا اذان ادا کی جاتی رہی۔ ایک اور متعلقہ امر یہ ہے کہ اذانِ اصطلاحی یعنی موجودہ اذان کے الفاظ وکلمات کے ساتھ مسلمانوں کو نماز کے لئے جمع کرنے کا کام اور اعلان بعد کا ہے لیکن نماز کے لئے جمع کرنے کی صورت پہلے بھی تھی خواہ وہ دوسری ندا رہی ہو یا منادی کی کوئی صورت رہی ہو۔ اعلان واذان تو وہ بھی تھی۔ موجودہ مدنی دور کی اذان تو محض اپنے طریقے کے سبب پسندیدہ ترین ہے۔ اس سے قبل پورے مکی دور میں پنج گانہ نمازوں کے قیام کے لئے بھی اعلان کی صورت تو بھی ہے۔

مکہ مکرمہ کے باہر دوسرا مقامِ جمعہ بحرین کا گاؤں یا قلعہ جواثی نامی تھا جہاں عبدالقیس کے مسلمانوں نے جمعہ قائم کیا تھا۔ اور وہ بھی مکی دور کا واقعہ ہے اور ہجرتِ نبوی سے قبل کا۔ ان کے بارے میں واضح روایات ملتی ہیں کہ یثرب کے بعد انہیں نے دوسرا جمعہ ادا کیا۔ بحرین کی مسجد جُواثی میں اقامتِ جمعہ کے وہی اسباب و وجوہ تھے جو یثرب کے تھے یعنی وہاں مسلمانوں کی جماعت ہی نہیں اکثریت تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پورے قلعے، گاؤں کی آبادی، خواہ کتنی کم رہی ہو، اسلام لا چکی تھی اور وہ سماجی وسیاسی وتہذیبی اور مذہبی اعتبار سے خود مختار تھے۔ نمازِ جمعہ کا قیام اُنہوں نے بھی رسولِ اکرم ﷺ کی اذن واجازت سے کیا تھا اور وہ بھی نمازِ ظہر کی بجائے ہفتے واری اجتماعی عبادت کی حیثیت سے کیا تھا۔ (۱۳۸)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے حدیثِ مذکورہ بالا کی تشریح میں عبادات سے متعلق ایک اصولی بات بھی لکھی ہے۔ یہ بات ظاہر ہے اور اس کی دلالت بھی پائی جاتی ہے کہ قبیلۂ عبدالقیس نے رسولِ اکرم ﷺ کے حکم و اجازت کے بغیر جمعہ نہیں قائم کیا تھا کیونکہ صحابۂ کرامؓ کی ایک معروف عادت یہ تھی کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ سے باقاعدہ اجازت لئے بغیر نزولِ وحی کے زمانے میں شرعی اُمور اپنی طرف سے طے نہیں کرتے تھے اور اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس کا قیام جائز نہ ہوتا: **ووجه الدلالة منه ان الظاهر ان عبد القيس لم يجمعوا الابامر النبى ﷺ لما عرف من عادة الصحابة من عدم الاستبداد بالامور الشرعية فى زمن نزول الوحى، ولانه لو كان ذلك لايجوز لنزل فيه القرآن۔**

نمازِ جمعہ کی ابتدا، مکی دور میں یثرب و جوائی میں اس کے قیام، شہر و مقامِ نبوی ﷺ اور مرکزِ اسلام مکہ مکرمہ میں اس کے عدمِ قیام اور دوسرے متعلقہ مسائل و احکام اور واقعات پر حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے یہاں کافی مواد موجود ہے جو اُنہوں نے مختلف امامانِ اسلام سے لیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے فقہاء علمانے بھی اس پر اپنی کتبِ سیرت و تاریخ اور مصادرِ فقہ و سنت اور مآخذِ قرآن و تفسیر میں کلام کیا ہے۔ ان تمام مباحث سے یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ ہجرت سے قبل یثرب اور جُوائی میں نمازِ جمعہ ادا کی گئی اور امرِ نبوی ﷺ سے ادا کی گئی تھی۔ لہٰذا اس کی مشروعیت مکی ہے۔ جن علمائے کرام نے اس کی فرضیت مدنی قرار دی ہے وہ رسولِ اکرم ﷺ کے حوالے سے ایسا کہتے ہیں۔ مسجدِ قباء میں رسولِ اکرم کی اولین نمازِ جمعہ اور اوّلین خطبۂ جمعہ اُسی مکی دور کے یثربی عملِ مسلم کی تصدیقِ نبوی تھی جیسی کہ آپ ﷺ کی سنت تھی۔ یہ اوّلین نبوی جمعہ و خطبہ بلا اذان ادا کیا گیا تھا کیونکہ اذانِ اصطلاحی اُس وقت تک مشروع نہیں ہوئی تھی، لہٰذا اس اذانِ اصطلاحی کو خواص الفرض قرار دینے کی کوئی صورت نہیں ہے اور سورۂ جمعہ کی آیاتِ کریمہ سے استدلال تو اور بھی غیر مناسب ہے کہ اس کا نزول اور بعد کا ہے۔

نمازِ شب (صلوٰۃ اللّیل)

مکی دورِ نبوی بالعموم فرائض و واجبات کا زمانہ سمجھا جاتا ہے اور اسی کے ساتھ بعض احکامِ حلال و حرام کا زمانہ بھی۔ دراصل فرائض و واجبات اور حلال و حرام دونوں ایک ہی سکے کے دو رُخ یا ایک تصویر کے دو زاویے ہیں۔ ان میں اثبات و نفی کا فرق ہے۔ اس کا مثبت حصہ فرض و واجب ہے تو منفی پہلو حرام و ممنوع۔ مثلاً ایمانیات میں توحید فرض و واجب ہے اور شرک حرام و ممنوع۔ اس کے پیچھے یہ فلسفہ یا نظریہ

کا رفرما ہے کہ مکی دور میں اسلام کسمپرسی کی حالت میں تھا لہٰذا وہاں صرف ضروری احکام دیئے گئے۔ ضروری احکام کے یہی دونوں پہلو بعد میں فرائض وواجبات اور حرام وممنوع احکام کی صورت یا تقسیم اختیار کر گئے۔

نماز (صلوٰۃ) کے ضمن میں یہی خیال، نظریہ اور فلسفہ کارفرما سمجھا گیا کہ مکی دور میں صرف نمازیں ہی مقرر کی گئی تھیں۔ وہاں سنت ونفل نمازوں کی ضرورت تھی اور نہ گنجائش کہ حالات وماحول صرف ضروریات ومبادیات ہی کے متقاضی تھے، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ روایاتِ حدیث وسیرت سے اس کی تردید ہوتی ہے اور قرآنِ مجید سے تو اس کی قطعی تغلیط ہو جاتی ہے۔ بالکل ابتدائی دور میں ہی رسولِ اکرم ﷺ کو سورۂ مزمل عطا فرمائی گئی جس میں آپ ﷺ کو رات میں نماز ادا کرنے کی ہدایت دی گئی۔ اس کو نمازِ شب، نمازِ تہجد اور صلوٰۃ اللیل کہا جاتا ہے۔ یہی حکم سورۂ بنی اسرائیل اور بعض دوسری سورتوں کی آیاتِ کریمہ میں بھی ہے۔ سورۂ مزمل میں حکمِ الٰہی ہے:

یٰایھا المزمل O قم اللیل الا قلیلا O نصفه او انقص منه قلیلا O
او زد علیه ورتل القراٰن ترتیلا O (۱۳۹)

اے جھرمٹ مارنے والے! کھڑا رہ رات کو، مگر کسی رات، آدھی رات یا اس سے
کم کر تھوڑا سا، یا زیادہ کر اس پر، اور کھول کھول کر پڑھ قرآن کو صاف

مفسرین ومحدثین اور اہلِ سیرت کا خیال ہے کہ رات کی نماز فرض قرار دی گئی تھی۔ وہ بعض کے مطابق اولین فرض نماز تھی اور رسولِ اکرم ﷺ کے لئے بھی فرض تھی اور دوسرے اسلام لانے والوں کے لئے بھی۔ رسولِ اکرم ﷺ اور آپ پر ایمان لانے والے مکی دور کے تمام صحابۂ کرامؓ بھی نمازِ شب (صلوٰۃ اللیل) ادا کیا کرتے تھے۔ (۱۴۰)

حافظ ابن کثیر کا خیال ہے کہ نمازِ شب صرف رسولِ اکرم ﷺ کی تنہا ذاتِ اقدس پر واجب تھی: وقد کان واجبا علیهٖ وحده اور اس کی دلیل سورۂ بنی اسرائیل کی آیت:

وَمِنَ الَّیْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّکَ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَکَ رَبُّکَ مَقَامًا
مَّحْمُوْدًا O (۱۴۱)

اور کچھ رات جاگتا رہ، اس میں یہ بڑھتی (فائدہ) ہے تجھ کو، شاید کھڑا کرے تجھ کو
تیرا رب، تعریف کے مقام میں۔

سے لائے ہیں اور سورۂ مزمل کی مذکورہ بالا آیاتِ کریمہ کے بارے میں کہا ہے کہ ان میں

آپ ﷺ کے قیامِ لیل کی مقدار کی تعیین کی گئی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ اور بعض دوسرے اہلِ علم نے اس نمازِ شب کو ذاتِ رسالت مآب ﷺ کے علاوہ مسلمانوں کے لئے بھی فرض قرار دیا ہے۔ لیکن تمام علما ومفسرین اور محدثین اور سیرت نگاروں کا اجماع ہے کہ نمازِ شب کی فرضیت اولین دور سے متعلق ہے۔

نمازِ شب (صلوٰۃ اللیل) کی فرضیت تسلیم کرنے والے علما، مفسرین اور شارحین کا بھی ایک اور اجماع ہے کہ وہ ایک سال بعد نفل قرار دے دی گئی تھی کیونکہ رات میں نماز ادا کرنا نفس کے لئے شاق تھا بالخصوص دن کی مشقت ومحنت کے بعد۔ سورۂ مزمل کی آخری آیتِ کریمہ میں سہولت کے ساتھ قرآن پڑھنے اور نماز ادا کرنے کی رخصت مختلف وجوہ سے دی گئی ہے: اِنَّ رَبَّکَ یَعْلَمُ اَنَّکَ تَقُوْمُ اَدْنٰی مِنْ ثُلُثَیِ الَّیْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِیْنَ مَعَکَ ؕ وَاللّٰهُ یُقَدِّرُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ؕ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ فَتَابَ عَلَیْکُمْ فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ (۱۴۲)

حافظ ابن کثیرؒ نے مشقت کے سبب اس نمازِ شب کے نفل ہونے کا ذکر کیا ہے:

ولکن لا تقدرون علی المواظبة علیٰ ما امرکم به من قیام اللیل لانه یشق علیکم..... ولکن قوموا من اللیل ماتیسر، وعبد من الصلاة بالقرأة کما قال فی سورة سبحان: ولاتجهر بصلوتک" ای بقرائتک..... " (۱۴۳)

اپنی تفسیر سورت کے اواخر میں نقل کیا ہے کہ آخری آیت کریمہ نے فرض کو منسوخ کر کے اسے نفل بنا دیا تھا۔ نمازِ شب کی مدتِ فرضیت پر اختلافِ اقوال کا ذکر کر کے گزشتہ بحث کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے کہ بارہ ماہ بعد تخفیف کر کے اسے فرض سے نفل بنا دیا گیا: "**ثم انزل اللّٰه التخفف فی آخر هذه السورة فصار قیام اللیل تطوعا من بعد فریضة**" اس سے قبل حولی (سال) اور بارہ ماہ کا ذکر ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بھی یہی مؤقف اختیار کیا ہے کہ وہ سال بھر بعد نفل کر دی گئی۔ (۱۴۴)

مکی روایاتِ حدیث وسیرت سے ثابت ہوتا ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ اور آپ کے بعض صحابہؓ کرامؓ بھی نمازِ شب ادا کرتے رہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نمازِ شب کا حوالہ اُن کی مسجد کے حوالے سے اور نبوی ﷺ نمازِ شب کا ذکر قریشی سرداروں کے استماعِ قرآن کے حوالے میں آچکا ہے۔ اس سے بڑھ کر قرآنی شہادت ہے جو عام مکی مسلمانوں کی نمازِ شب کے معمول کو بڑے خوبصورت اور اثر انگیز انداز میں بیان کرتی ہے:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ O وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ O(۱۷۵)

وہ تھے رات کو تھوڑا سوتے اور صبح کے وقتوں معافی مانگتے۔

تتجافى جنوبهم عن المضاجع يدعون ربهم خوفا وطمعا.....حواله (۱۴۶)

الگ رہتی ہیں اُن کی گردنیں، اپنی سونے کی جگہ سے، پکارتے ہیں اپنے رب کو، ڈر سے اور لالچ سے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ بہ ذیل تفسیر سورۂ مدثر

۲۔ تفہیم القرآن: ج ۶، ص ۱۴۳

۳۔ ۱/ ۱۲۷۔ سعید احمد پالن پوری، رحمتہ اللہ الواسعۃ، مکتبۂ حجاز دیوبند ۲۰۰۲ء/ ج ۲، ص ۴۳۱۔۴۳۳

۴۔ تفہیم/ ج ۶، ص ۱۴۳

۵۔ عہدِ جاہلی میں حنیفیت، معارف اعظم گڑھ، اکتوبر، نومبر ۲۰۰۳ء

۶۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۱۵۷ وغیرہ دوسرے اہلِ سیر

۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم/ عیسیٰ البابی الحلبی، مصر/ ج ۴، ص ۴۴۰۔۴۴۱

۸۔ مدثر: ۴

۹۔ بیان القرآن/ تاج طبع دہلی/ ج ۱۲، ص ۵۶

۱۰۔ صحیح، کتاب التفسیر، سورۃ المدثر، ۴۔ باب وثیابک فطھر۔ رقم ۴۹۲۵

۱۱۔ ابن حجر، فتح الباری، طبع بیروت، ۱۹۹۷ء/ ج ۸، ص ۸۷۷۔۸۷۸

۱۲۔ ابن ہشام/ السیرۃ النبویۃ/ ج ۱، ص ۳۴۵۔ سہیلی، الروض الانف/ ج ۳، ص ۲۶۶۔۲۶۷ نیز ۲۷۳۔۲۷۷۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مطبعۃ السعادۃ مصر، ۱۹۳۷ء، ۳/ ۸۰۔۸۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت، ۱۹۵۷ء/ ج ۳، ص ۲۶۸

۱۳۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۸۴

۱۴۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۸۴۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۹۹

۱۵۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۴۳۶۔۴۳۷۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۶۷، ۱۰ تا ۱۱۱۔ طبری/ ج ۲، ص ۳۵۸۔۳۵۹۔ ابن کثیر/ ج ۳، ص ۱۵۲

۱۶۔ ایضاً (روایات مذکورہ بالا)

۱۷۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۱۸۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۱۱۱

۱۹۔ حجتہ اللہ البالغہ/ ج ۱، ۱۲۷

۲۰۔ الاتقان، /۱.....نوع ۱۲۔، اُردو ترجمہ/ ج ۱، ص ۹۵

۲۱۔ فتح الباری، طبع ریاض/ ج ۱، ص ۳۰۷

۲۲۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۴۔ طبری، تاریخ/ ج ۲، ص ۳۰۴، ۳۰۷۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۲۴: میں اضافہ ہے کہ وہ چشمہ زمزم کے سوتے سے پھوٹا تھا۔ بلاذری، انساب/ ج ۱، ص ۱۱۱: فعلم جبریل النبی ﷺ الوضوء، فمضمض ثم استنشق و غسل رجلیه ثم نفح تحت ازاره طبری کی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ تعلیمِ وضو کا دن دوشنبہ کا تھا۔ تاریخ الطبری/ ج ۲، ص ۳۰۴۔ نیز سہیلی، الروض الانف/ ج ۳، ص ۱۳۔۱۴، جبکہ دو دن پہلے سنیچر اور اتوار کو صرف جبریل علیہ السلام کی روح حاضر رہی تھی، بعثت و نبوت یعنی تنزیلِ قرآنی دوشنبہ کو ہوئی اور اُسی دن وضو کی تعلیم ہوئی، ابن اثیر، الکامل/ ج ۲، ص ۵۰۔۵۱

۲۳۔ فتح الباری/ ج ۱، ص ۳۰۷۔

۲۴۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۱۳۔۱۴۔ اُردو ترجمہ از محمد سعید الرحمٰن علوی، لاہور ۱۹۹۰ء، ۱۰۵ (اصل متن مرتبہ و محققہ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی) نیز حاشیہ نمبر ۳،۲۷، ۲۷۴، ۲۷۔ جس میں ابن اسحاق، سہیلی اور ابن عبدالبر جیسے امامانِ سیرت کی روایات کے حوالے دیئے گئے، نیز ملاحظہ ہو: مودودی، سیرتِ سرورِ عالم/ ج ۲، ص ۱۴۳، ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ/ ج ۱، ص ۱۵۳۔ مولانا مودودی نے ابن اسحاق/ ابن ہشام، ابن ماجہ، طبرانی، ابن جریر طبری، ابن کثیر اور امام احمد بن حنبل کے حوالوں سے اپنی روایات نقل کی ہیں، جبکہ مولانا کاندھلوی نے دلائل ابی نعیم، عسقلانی، مسندِ احمد، سننِ دارقطنی، مستدرکِ حاکم، علامہ عزیز کی شرح جامع صغیر (السراج المنیر) سننِ ابن ماجہ، سہیلی، ابن سید الناس کی روایات اور اقوال جمع کر دیئے ہیں۔

۲۵۔ عیون الاثر، مطبعۃ مؤسسۃ عز الدین، بیروت، ۱۹۸۶ء/ ج ۱، ص ۱۲۱

۲۶۔ ج ۳/ ۱۳۔۱۴

۲۷۔ ج ۱، ص ۱۵۳ بحوالہ روض الانف/ ج ۱، ص ۱۶۳

۲۸۔ کتاب اللباس، ۱۳۰۔ باب قص الشارب، فتح الباری/ ج ۱۰، ۴۱۲ و مابعد، رقم ۵۸۸۹۔

۲۹۔ ج ۱۰، ص ۴۱۵ و مابعد

۳۰۔ ج ۱، ص ۱۲۷

۳۱۔ فتح الباری/ ج ۱۰، ص ۴۱۴۔۴۳۱

۳۲۔ حدیثِ نبوی، فتح الباری/ ج ۱، ۵۱۸ و مابعد کتاب الحیض۔ اس حدیث کے اطراف ۵۸۹۱ اور ۶۲۹۷ میں بھی پائے جاتے ہیں۔

۳۳۔ سورۂ بقرہ: ۲۲۲۔۲۲۳، ابن کثیر، تفسیر/ ج ۱، ص ۲۵۸۔۲۶۵

۳۴۔ بخاری، کتاب الحیض، فتح الباری/ ج ۱، ص ۵۱۸۔۵۵۸

۳۵۔ (اطرافہ فی: ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۵۳۴۰، ۵۳۴۱، ۵۳۴۲، ۵۳۴۳) بخاری، کتاب الحیض، رقم ۳۱۳۔ باب الطیب للمرأۃ عند غسلاً من المحیض۔ فتح الباری/ ج ۱، ص ۵۳۶-۵۳۷ وغیرہ مابعد۔

۳۶۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۱۵۶

۳۷۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۵

۳۸۔ اصابہ/ ج ۴، ص ۴۱۶

۳۹۔ مزید بحث کے لئے ملاحظہ ہو خاکسار کا مقالہ ''حضرت اُم ایمنؓ۔ رسول اکرم ﷺ کی انا'' معارف، اعظم گڑھ، فروری۔ مارچ ۲۰۰۳ء

۴۰۔ سورۃ الانبیاء: ۷۳

۴۱۔ سورۂ ابراہیم: ۳۷

۴۲۔ سورۂ ابراہیم: ۴۰

۴۳۔ سورۃ البقرہ: ۱۲۵

۴۴۔ سورۂ مریم: ۵۵

۴۵۔ سورۂ طٰہٰ: ۱۴

۴۶۔ سورۂ مریم: ۳۱

۴۷۔ سورۂ لقمان: ۱۷

۴۸۔ سورۂ ہود: ۸۷

۴۹۔ سورۂ مریم: ۵۹

۵۰۔ سیرۃ النبی/ ج ۵، ص ۴۶، نیز ماقبل/ ج ۵، ص ۳۹، جس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ ''خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے'' انہوں نے ''حیثیت'' کی مزید تشریح حاشیے میں کی ہے اور کتب سابقہ سے مدلل کیا ہے۔

۵۱۔ حجۃ اللہ البالغہ/ ج ۱، ص ۱۲۷۔

۵۲۔ بحوالہ الکامل/ ج ۲، ص ۲۱: ذکر الاختلاف فی اول من اسلم۔

۵۳۔ الکامل/ ج ۲، ص ۵۹، بلاذری، انساب/ ج ۱، ص ۱۱۷

۵۴۔ فتح الباری/ ج ۷، ص ۲۱۹۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۳۵ بہ اختلاف الفاظ

۵۵۔ فتح الباری/ ج ۷، ص ۱۸۱

۵۶۔ فتح الباری/ ج ۷، ص ۱۸۳

۵۷۔ مغازی رسول اللہ، اُردو/ص ۱۰۵-۱۰۶

۵۸۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ/ ج ۱، ص ۲۴۴

۵۹۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۴۲

۶۱۔ طبری/ ج ۲، ص ۳۰۴، ۳۰۷

۶۱۔ بلاذری، انساب الاشراف/ ج ۱، ص ۱۱۱ بروایتِ ابن سعد و واقدی۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۲۴ بروایت ابن اسحاق: ابن اثیر، الکامل/ ج ۲، ص ۵۰-۵۱۔ ابن سید الناس، عیون الاثر/ ج ۱، ص ۱۲۱-۱۲۲، بروایتِ ابن اسحاق، اس مقطوع روایت کو حافظ موصوف نے موصول بنایا ہے اور اس کو حدیث حضرت اُسامہ بن زیدؓ قرار دیا ہے۔ انہوں نے بعض دوسری روایات اور اسناد بھی بیان کی ہیں۔

۶۲۔ سیرۃ النبی/ ج ۵، ص ۴۴

۶۳۔ سیرۃ المصطفیٰ/ ج ۱، ۱۵۳

۶۴۔ سیرتِ سرورِ عالم/ ج ۲، ص ۱۴۳

۶۵۔ الرحیق المختوم، اُردو، علی گڑھ، ۱۹۸۸ء/ ص ۱۱۷-۱۱۸

۶۶۔ سورۂ مومن: ۵۵

۶۷۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۱۱-۱۲

۶۸۔ البدایہ/ ج ۳، ص ۱۱۳، ۱۱۷-۱۱۸۔

۶۹۔ ج ۳، ص ۲۴، ۱۱۳، حافظ ابن حجر (فتح الباری/ ج ۳، ص ۶۰۳ وغیرہ)، امام سہیلی (الروض ۱/ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۳-۲۴۸، حاشیہ، ابن سید الناس/ ج ۱، ص ۱۲۱-۱۲۲۔ ادریس کاندھلوی/ ج ۱، ص ۱۵۴

۷۰۔ عیون الاثر/ ج ۱، ص ۱۲۱

۷۱۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۴، نیز طبری، تاریخ/ ج ۲، ص ۳۰۷۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۲۴۔ سہیلی/ ج ۲، ص۔ ابن اثیر، الکامل/ ج ۲، ص ۵۰-۵۱۔ ابن سید الناس/ ج ۱، ص ۱۲۴: عن ابی رافع قال صلی النبی اول یوم الاثنین وصلت خدیجۃؓ آخر یوم الاثنین..... نیز وضو کی تعلیم جبرائیلؑ سے متعلق دوسرے حوالے

۷۲۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۷۔ نیز سہیلی/ ج ۳، ص ۸، ۵۴۔ طبری، تاریخ/ ج ۲، ص ۲/ ۳۱۸۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۳۷۔ نیز/ ج ۳، ص ۲۴، ۲۶، ۲۷، ابن اثیر، الکامل/ ج ۲، ص ۵۸۔ ابن سید الناس/ ج ۱، ص ۱۲۵ و مابعد۔

۷۳۔ الکامل/ ج ۲، ص ۵۷۔ ابن سید الناس/ ج ۱، ص ۱۲۴

۷۴۔ اسد الغابہ/ ج ۱، ص ۱۸۷۔ اصابہ/ ج ۱، ص ۲۳۷

۷۵۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۷۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۹۔ طبری، تاریخ/ ج ۲، ص ۳۱۷۔ ابن سید الناس/ ج ۱، ص ۱۲۶

۷۶۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۴۹-۲۵۰۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۴۳ و مابعد۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۲۷۔ نیز/

ج ۳،ص ۲۹: خرج ابوبکر یرید رسول اللّٰہ و کان له صدیقا فی الجاهلیة فلقیه نیز ابن سعد/ ج ۳، ص ۱۷۱-۱۷۲ و مابعد۔ ابن سید الناس/ ج ۱،ص ۱۲۶

۷۷۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۲۵۲: فصلوا و صدقوا رسول اللّٰہ بما جاء ہ من اللّٰہ طبری، تاریخ/ ج ۲،ص ۳۱۷۔ ابن اثیر، الکامل/ ج ۲،ص ۵۹: حین استجابوا له فاسلموا و صلوا ابن سید الناس/ ج ۱،ص ۱۲۷

۷۸۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۳۸۲۔ سہیلی۔ ابن کثیر/ ج ۳،ص ۹۹۔ ابن سید الناس/ ج ۱،ص ۱۲۱-۱۲۷ و مابعد

۷۹۔ طبری، تاریخ/ ج ۲،ص ۳۱۱۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۲،ص ۳۱۳/ ج ۳،ص ۲۵۔ عیون الاثر/ ج ۱،ص ص ۱۲۵۔ اصابہ، استیعاب وغیرہ میں خاکہ۔ نیز ابن اثیر، الکامل/ ج ۲،ص ۵۷

۸۰۔ ابن اثیر، الکامل/ ج ۲،ص ۵۹۔ نیز ابن کثیر/ ج ۳،ص ۲۵

۸۱۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۲۶۳

۸۲۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۳۴۲

۸۳۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۳۴۷

۸۴۔ عیون الاثر/ ج ۱،ص ۱۶۳

۸۵۔ عن عبداللہ بن عمرو بن العاص: کتاب فضائل اصحاب النبی، ۵- باب قول النبی لو کنت متخذا خلیلا فتح الباری/ ج ۷،ص ۲۹ و مابعد۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳،ص ۴۶

۸۶۔ کتاب الصلوٰۃ، باب المرأۃ تطرح عن المصلی شیئا من الاذی رقم ۵۲۰۔ فتح الباری/ ج ۱،ص ۷۱۷-۸۱۸۔ نیز کتاب الوضوء، باب اذا القی علی ظهر المصلی قذی اور جیفة لم تفسد علیه صلاته، فتح الباری/ ج ۱،ص ۴۵۴: دوسری کتابوں اور ابواب میں احادیث: ۲۹۳۴، ۳۱۸۵، ۳۸۵۴، ۳۹۶۰

۸۷۔ ابن کثیر، البدایہ: ۴۳-۴۴ میں اس معنی کی متعدد روایات ہیں۔

۸۸۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۳۱۵

۸۹۔ الاسراء: ۱۱۰

۹۰۔ ج ۱،ص ۱۴۴

۹۱۔ ابن ہشام/ ج ۱،ص ۳۷۳۔ سہیلی/ ج ۳،ص ۳۳۷۔ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ہجرۃ النبیؐ واصحابہ الی المدینۃ۔ فتح الباری/ ج ۷،ص ۲۸۷-۲۹۱ وغیرہ۔

۹۲۔ بلاذری/ ج ۱،ص ۱۶۲

۹۳۔ مزید بحث کے لئے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب ''مکی اُسوۂ نبوی ﷺ مسلم اقلیتوں کے مسائل کا حل''۔

۹۴۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیت کریمہ مذکورہ بالا متعدد تفاسیر میں:

۹۵۔ فتح الباری/ ج ۱،ص ۶۶۲

۹۶۔ بخاری، کتاب الصلاۃ، باب التوجه نحو القبلة حیث کان فتح الباری/ ج ۱،ص ۶۶۱-۶۶۲

۹۷۔ سورۃ البقرۃ: ۱۴۳

۹۸۔ ابن کثیر، تفسیر، العرفان، کویت ۱۹۹۶ء/ ج ۱، ص ۲۴۹-۲۵۰ اور ۲۵۲-۲۵۳ اور دوسرے مفسرین و محدثین کرام

۹۹۔ فتح الباری/ ج ۱، ص ۶۶۲۔ ابن کثیر، تفسیر/ ج ۱، ص ۲۴۹

۱۰۰۔ تفسیر/ ج ۱، ص ۲۴۹ و مابعد

۱۰۱۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۲۹۸-۲۹۹۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۱۲۶ و مابعد۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۴۳

۱۰۲۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۴۷۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۲۶۸ و مابعد۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۸۱۔

۱۰۳۔ مزید حوالوں کے لئے ملاحظہ ہو: بلاذری، انساب/ ج ۱/۔ طبری ۲۶۶، تاریخ / ج ۲، ص ۳۶۰۔ ۳۶۱۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳، ص ۱۵۸ رومابعد۔ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۴۴۰۔ اور نہ صرف مکی مسلمانوں کا بلکہ اس دور میں تمام مسلمانوں کا خواہ اُن کا تعلق کسی جگہ سے بھی ہو، قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔

۱۰۴۔ بحث کے لئے ملاحظہ ہو: مودودی، سیرت سرورِ عالم/ ج ۲، ص ۶۴۳-۶۴۴۔ شبلی وسلیمان، سیرت النبی/ ج ۲، ص ۱۱۰-۱۱۴ رومابعد۔ ادریس کاندھلوی/ ج ۱، ص ۲۸۷-۲۸۸۔ مسعود احمد، تاریخ الاسلام والمسلمین/ ص ۱۳۳-۱۴۴۔ فتح الباری/ ج ۶، ص ۶۳۶ و مابعد نیز ۵۵۵ و مابعد۔ نیز دیگر کتب سیرت و تاریخ۔

۱۰۵۔ فتح الباری/ ج ۱، ص ۵۹۰

۱۰۶۔ بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء، فتح الباری/ ج ۱، ص ۵۹۵-۵۹۶، حدیث ۳۴۹، نیز ۶۳۶ اور ۳۳۴۲۔ کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکہ، کتاب احادیث الانبیا، باب المعراج، کتاب التفسیر، سورۂ بنی اسرائیل وغیرہ۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء وذکر سدرۃ المنتہیٰ، کتاب الفضائل، باب موسیٰ، کتاب الایمان، باب ذکر المسیح بن مریم۔ ابن اسحاق/ ابن ہشام/ ج ۱، ص ۳۹۶-۴۰۰ و مابعد، اور دوسرے تمام اہل سیر و مغازی جیسے ابن سعد، بلاذری، یعقوبی، ابن اثیر، ابن کثیر، ابن سید الناس وغیرہ۔

۱۰۷۔ کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء، فتح الباری/ ج ۱، ص ۶۰۱-۶۰۲۔ مسعود احمد/ ص ۱۴۰ وغیرہ

۱۰۸۔ فتح الباری/ ج ۱، ص ۶۰۲

۱۰۹۔/ ج ۱، ص ۱۹۶-۱۹۸

۱۱۰۔ سورۂ مومن: ۵۵

۱۱۱۔ سہیلی/ ج ۳، ص ۱۱-۱۲

۱۱۲۔ سیرت النبی/ ج ۲، ص ۸۳-۸۵

۱۱۳۔ مؤطا، کتاب مواقیت الصلوٰۃ،، بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، ۱- باب مواقیت الصلاۃ وفضلا، مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب اوقات الصلوات الخمس۔ فتح الباری/ ج ۲، ص ۵-۱۰، نیز و مابعد۔ ابن اسحاق، ابن ہشام/

ج۱،ص ۲۴۳۔ سہیلی/ ج ۳،ص ۷۔ نیز: ۱۱-۱۵۔

۱۱۴۔ فتح الباری/ ج ۲،ص ۹-۱۰، ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳،ص ۱۱۷-۱۱۸

۱۱۵۔ بخاری: کتاب الاذان، باب الجہر بقرأۃ صلاۃ الفجر، حدیث ۷۷۴۔ فتح الباری/ ج ۲،ص ۳۲۸-۳۳۰۔ ابن کثیر/ ج ۳،ص ۱۱۸ میں جہری رکعتوں اور نمازوں کا ذکر واضح طور سے موجود ہے اور علما وصحابہؓ وتابعین کا فتویٰ بھی۔

۱۱۶۔ کتاب الاذان، باب رفع البصر الی الامام فی الصلوٰۃ، حدیث ۷۴۶ وغیرہ۔ فتح الباری/ ج ۲،ص ۳۰۰۔ نیز باب القرأۃ فی الظہر، والعصر، فتح الباری/ ج ۲،ص ۳۱۸

۱۱۷۔ بخاری، کتاب الاذان، باب الجہر فی المغرب، باب الجہر لقرأۃ صلوٰۃ الفجر، وغیرہ ابواب۔ فتح الباری/ ج ۲،ص ۳۲۱-۳۲۸ ومابعد۔

۱۱۸۔ سیرۃ النبی/ ج ۵،ص ۱۱۶-۱۱۷ ومابعد۔

۱۱۹۔ ابن کثیر، البدایہ/ ج ۳،ص ۹۲ ومابعد۔ فتح الباری/ ج ۳،ص ۹۵-۹۸۔ بخاری، کتاب العمل فی الصلاۃ، باب ماینہیٰ من الکلام فی الصلاۃ، حدیث ۱۱۹۹-۱۲۰۰، نیز طرف آخر ۴۵۳۴ وغیرہ۔ ابن کثیر نے بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی کی دوسری روایات کا بھی حوالہ دیا ہے۔

۱۲۰۔ فتح الباری: ج ۲،ص ۳۰۶-۳۱۵۔ بحث برحدیث ۷۵۶: عن عبادۃ بن الصامت ان رسول اللہ قال لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب، بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القرأۃ للامام والماموم فی الصلوات، کتاب التفسیر، سورہ ۱، باب ماجاء فی فاتحۃ الکتاب، فتح الباری/ ۸،ص ۱۹۵-۱۹۷

۱۲۱۔ تفہیم القرآن/ ج ۱، الف: الفاتحہ۔

۱۲۲۔ ابن کثیر، تفسیر، سورۂ فاتحہ/ ج ۱،ص ۸-۱۲ ومابعد۔ بخاری، کتاب الاذان، باب الجمع بین السورتین، باب یقرا فی الآخریین بفاتحۃ الکتاب بالخصوص حدیث ۷۷۶: ان النبیؐ کان یقرا فی الظہر فی الاولیین بام الکتاب و سورتین..... ھکذا فی العصر الخ ..... فتح الباری/ ج ۲،ص ۳۳۵-۳۳۹، نیز دوسرے ابواب کتاب بخاری۔

۱۲۳۔ تخریج کشاف/ ج ۱،ص ۱۸

۱۲۴۔ قرطبی/ ج ۱،ص ۱۷۰، آلوسی، روح المعانی/ ج ۱،ص ۹۷، صابونی، روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام/ ج ۱،ص ۳۱۔

۱۲۵۔ کتاب مواقیت الصلاۃ و فضلا ۱۰۶ باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ حدیث ۷۷۴

۱۲۶۔ حدیث نمبر ۷۷۵ وغیرہ

۱۲۷۔ بخاری، کتاب الاذان، باب التشہد فی الآخرۃ، مختلف ابواب میں، فتح الباری/ ج ۲،ص ۴۰۲-۴۱۰، نیز/ ج ۲،ص ۴۱۴-۴۱۵

۱۲۸۔ فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۱۴-۴۱۵

۱۲۹۔ کتاب الاذان، باب مذکورہ بالا، حدیث ۸۳۴۔ نیز ۶۳۲۶، ۷۳۸۸ دوسرے ابواب، فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۱۰-۴۱۴

۱۳۰۔ تبصرہ وحاشیہ عبدالرحمٰن الوکیل بر الروض الانف/ ج ۴، ص ۱۰۴: والمسلم لایطمئن قلبه فیما یتعلق بالعبادة الا لما نقل نقلا صمیما یغمر القلب بالسکنیة، والروح بالدلالة ولن تطمئن نفس مسلم الی ان الجمعة کانت صلاة ابتداء الانصار من عندهم۔

۱۳۱۔ بخاری، کتاب الجمعہ، مختلف ابواب بالخصوص اولین باب فرض الجمعہ اور تشریح ابن حجر، فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۵۶ ومابعد۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۱۰۲ ومابعد۔

۱۳۲۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۱۰۲: ان الیهود اُمروا بیوم من الاسبوع، لیظمون الله فیه، ویتفرغون لعبادته، فاختاروا من قبل انفسهم السبت، فالزموه فی شرعهم، کذلک النصاریٰ اُمروا علی لسان عیسیٰ بیوم من الاسبوع، فاختاروا من قبل انفسهم الاحد، فالزموه شرعالهم نیز تبصرہ سہیلی۔ نیز ملاحظہ ہو، تعلیقاتِ مرتب الروض الانف، عبدالرحمٰن الوکیل/ ج ۴، ص ۱۰۴- ۱۰۵ ومابعد۔ بخاری، کتاب الجمعہ، ۱۔ باب فرض الجمعة، حدیث: ۸۷۶: عن ابی هریرة انه سمع رسول اللهؐ یقول نحن الآخرون السابقون یوم القیامة، بیدانهم اوتوا الکتاب من قبلنا، ثم هذا یومهم الذی فُرض علیهم فاختلفوا فیه. فهدانا الله له، فالناس لنا فیه تبع: الیهود غدا، والنصاریٰ بعد غد فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۵۶ ومابعد۔

۱۳۳۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۱۰۲-۱۰۳: وفی الاثر ان یوم الجمعة سمی الجمعة، لانه جُمع فیه خلق آدم وموافقة الحکمة ان الله تعالیٰ لما بدأ فیه خلق انبیا آدم، وجعل فیه بدء هذا الجن وهو البشر، وجعل فیه فناء هم و انقضاء هم اذ فیه تقوم الساعة، وجب ان یکون یوم ذکر و عبادة

۱۳۴۔ ملاحظہ ہو: حافظ ابن حجر کی بحث بر مشروعیت، فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۵۷ ومابعد۔

۱۳۵۔ بخاری، کتاب الجمعة، ۱۔ باب فرض الجمعة، حدیث ۸۹۲، نیز ۴۳۷۱۔ فتح الباری/ ج ۲، ص ۲/ ۴۸۸-۴۸۹ وغیرہ۔ نیز بخاری، کتاب الجمعہ، ۱۱۔ باب الجمعة فی القریٰ والمدن، حدیث ۸۹۲: ان اوّل جمعة جمعت بعد جمعة فی مسجد رسول اللّٰه ا فی مسجد عبدالقیس بجواثی من البحرین. فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۸۸-۴۸۹

۱۳۶۔ ابن ہشام/ سہیلی/ ج ۴، ص ۷۴-۷۵، ۱۰۰-۱۰۹، فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۵۷-۴۵۸ بحوالہ روایت عبدالرزاق حافظ ابن حجر نے نقل کیا ہے کہ اہلِ مدینہ نے رسولِ اکرم کی مدینہ تشریف آوری سے قبل اور جمعہ کے نزول سے بھی پہلے جمعہ پڑھا۔ محرک یہ تھا کہ یہود سبت کے دن اور نصاریٰ اتوار کے دن اجتماعی عبادت کرتے تھے۔ انصار نے کہا کہ ہم بھی ایک ہفتہ واری دن مقرر کریں اور جمعے کا دن مقرر کیا۔ اور حضرت اسعد بن زرارہ نے ان کو اولین

جمعہ پڑھایا۔ یہی روایت احمد، ابوداؤد اور ابن ماجہ کے ہاں بھی ہے اور امام ابن خزیمہ جیسے علما نے اس کی تصحیح کی ہے۔

۱۳۷۔ ابن ہشام۔ سہیلی/ ج ۴، ص ۲۳۲: فادرکت رسول اللہ الجمعة فی بنی سالم بن عوف، فصلاها فی المسجد الذی فی بطن الوادی وادی رانونا، فکانت اول جمعة صلاها بالمدینة. مسجد قباء بنو عمرو بن عوف کے لئے تعمیر کی گئی تھی جیسا کہ سہیلی نے لکھا ہے (ج ۴، ص ۲۵۴-۲۵۵) اس کو اسلام کی اوّلین مسجد کہا گیا ہے اور وہ ظاہر ہے کہ اولین مسجد اس معنی میں تھی کہ اس کی تعمیر نبوی دستِ مبارک سے ہوئی تھی ورنہ مساجد تو اس سے قبل بہت سی بن چکی تھیں اور وہ سب اسلامی مساجد تھیں۔

۱۳۸۔ بخاری، کتاب الجمعہ، ۱۱۔ باب الجمعة فی القریٰ والمدن، حدیث ۸۹۲، مذکورہ بالا مع متن، فتح الباری/ ج ۲، ص ۴۸۸-۴۸۹

۱۳۹۔ سورۃ المزمل

۱۴۰۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن/ ج ۴، ص ۴۳۴۔ مسعود احمد/ ص ۱۲-۱۳۔ شاہ ولی اللہ، فتح الرحمٰن/ ص ۶۹۴: ''در ابتدائے اسلام خدائے تعالیٰ قیام لیل بر آں حضرت و بر مسلمانان موکد گردانید''

۱۴۱۔ سورۃ بنی اسرائیل: ۷۹

۱۴۲۔ سورۃ مزمل: ۲۰

۱۴۳۔ تفسیر ابن کثیر/ ج ۴، ص ۴۳۴-۴۳۹ بالخصوص ۴۳۶

۱۴۴۔ حجۃ اللہ البالغہ/ ص ۶۹۴

۱۴۵۔ سورۃ الذاریات: ۱۷-۱۸

۱۴۶۔ سورۃ الم سجدہ: ۱۶

السید کمپوزرز
Al-Syed Composers
مناسب قیمت پر معیاری
عربی، اردو، انگلش کمپوزنگ اینڈ ڈیزائننگ
رابطہ کیجئے
سید قادر معین (بابر) 0300-2093965